جہان حیرت کا مسافر ۔ رفیع رضا
عرفان ستار۔۔۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ میں نے اب سے پہلے رفیع رضا کو پڑھنے کی طرح نہیں پڑھا تھا۔ اسی طرح پڑھا تھا جیسے فیس بک پر سب پڑھتے ہیں۔ ایک عرصے تک تو رفیع میری فرینڈز لسٹ میں بھی شامل نہیں تھا۔ مگر اس دوران میں وہ اپنی غزلوں کے لنک مجھے ای میل کرتا تھا اور میں ایک سرسری پڑھت کے بعد جو مناسب سمجھتا تھا، وہ رائے دے دیتا تھا۔ ﷲ خیر صلا۔ مگر اس دوران بھی بحیثیت شاعر، میرے دل میں رفیع کی قدر و قیمت موجود تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے رویّے کی شدّت دوسروں کی طرح مجھے بھی پریشان کرتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شخص دل جمعی سے شاعری کرنے کی بجائے یہاں وہاں جھگڑے کیوں مولتا پھرتا ہے؟ آخر مسئلہ کیا ہے اس کا؟ پاگل ہے؟ ذہنی مرض میں مبتلا ہے؟ خود پسند ہے؟ حاسد ہے؟ کیا ہے آخر؟ اس مسئلے کو زیادہ گمبھیر میں نے ایک ملاقاتیں ہوگئیں۔ یہ کیا؟ یہ تو یوں بنا لیا کہ کینیڈا آنے کے بعد رفیع سے دو کوئی اور ہی شخص ہے۔ پُرخلوص۔ گرم جوش۔ سلیقے کی گفتگو کرنے والا۔ تو پھر وہ کون ہے جو فیس بک پر آگ اگلتا پھرتا ہے؟ یہ مسئلہ کبھی میرے لیے سلجھنے والا نہ تھا اگر بھائی فرحت عباس شاہ نے مجھ سے رفیع کی شاعری پر کچھ لکھنے کے لیے نہ کہا ہوتا۔ جب یہ ہوا تب بھی میرا ابتدائی ردِ عمل کوئی بہت مثبت نہ تھا، اگرچہ میں نے اس کا اظہار نہ کیا۔ ذہن میں یہ آیا کہ کیا مصیبت ہے۔ کس نے میرا نام سجھا دیا شاہ جی کو؟ خواہ مخواہ رفیع کی شاعری پر لکھ کر اس کے مخالفین کی باتیں سننے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر سوچا چلو خیر ہے۔ کاریگری دکھا دوں گا۔ صاحبِ اسلوب، جدید فکر کا حامل، تازہ کار، اور اس قسم کی چند باتیں پھیلا کر لکھ دوں گا، جس میں کوئی فقرہ قابل گرفت نہ ہوگا۔ سوال اٹھانے والوں سے کہہ دوں گا کہ یار۔ دنیا داری بھی کوئی چیز ہے۔ اگر نہ لکھتا تو لوگ کہتے کہ میں رفیع سے جلتا ہوں۔ نمبر ون کی لایعنی بحث بھی تو چھڑی ہوئی ہے۔ نہ لکھتا تو لوگ کہتے رفیع کے نمبر ون شاعر ڈکلیئر ہوجانے سے ڈرتا ہوں، اس لیے لکھ دیا۔ خیر ہے یار۔ دو ایک دن میں تحریر اپنی موت آپ مر جائے گی۔ لوگوں کی یاداشت بڑی مختصر مدت کی ہوتی ہے۔ کس کو یاد رہے گا؟

خیر اسی ذہنی کیفیت میں ''ستارہ لکیر چھوڑ گیا'' کا مطالعہ شروع کیا۔ پہلی بار سرسری نظر دوڑائی۔ وہی تاثر ابھرا کہ جو پہلے سے تھا۔ اچھا شاعر ہے۔ مگر اتنا بھی اچھا نہیں۔ اخاہ۔ یہ لفظ کیسے استعمال کیا ہے؟ اور یہ ترکیب؟ یار کیسی پتھریلی زمین ہے۔ شدت ہے، مگر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چلو کل بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹے میں نمٹا دوں گا مضمون۔ خیال سے لکھنا ہوگا۔ کوئی فقرہ سخت نہ ہو۔ کوئی بات حتمی نہ ہو۔ بس بین بین چلتا ہوا سلامتی سے گزرجاؤں گا۔

اگلے دن پھر کتاب کھولی اور ذہن کو ایک شعر نے زوردار جھٹکا دیا۔

سو پھیلنے کی اسی حد پہ علم جاکے رکا
میں کہہ رہا تھا جہاں یہ سمٹنے والا ہے

یہ کیا ہے؟ ایکسپینڈنگ یونیورس تھیوری؟ مگر اس کا غزل میں کیا کام؟ اور پھر شاعر یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جہاں سمٹنے والا ہے؟ گویا سائنس کا یہ ماننا کہ کائنات مسلسل پھیلنے کے عمل سے گزر رہی ہے، اور یہ عمل کسی وقت پلٹے گا، اور کائنات ایک مرکز کی جانب پھر سمٹے گی اور نتیجہ؟ وہ سب ٹھیک مگر یہ تھیوری غزل میں کیا کررہی ہے؟ کمال ہے۔ اور دیکھیں؟ چلو چلو۔۔آگے بڑھو۔

یہ جو موجود ہے، اسی میں کہیں
اک خلا ہے، تجھے نہیں معلوم

پیریلل یونیورس تھیوری؟ نا ممکن۔ یہ تکا ہے یار۔ شاعر کو کہاں معلوم ہوگا۔ یونہی لکھ دیا اور میں اس کو اپنے حساب سے توجیہ دینے لگا۔ پرے ہٹاؤ یار۔ غزل کو غزل کی طرح پڑھو۔

نظر آتا ہے سر پر، اور نہیں ہے
رضا اس آسماں کا کیا کیا جائے؟

نہیں یار یہ خالص سائنس ہے۔ یہ تکا نہیں ہوسکتا۔ بالکل صاف، واضح شعر ہے۔ آسماں کا کوئی وجود نہیں۔ بس خلا ہے۔ اتھاہ، لاانت خلا۔ یہ آسمان صرف نظر کا دھوکہ ہے۔ یہ شخص کسی اور مقام سے کلام کررہا ہے۔ ہوشیار باش۔ ذرا خیال سے۔ معاملہ نازک ہے۔

دھڑکتی رہتی ہے کوئی گھڑی مرے دل میں
یہ وقت میرے ہی چکر سے ہوکے جاتا ہے

وجود سے باہر وقت کی کوئی حقیقت نہیں؟ ٹائم اینڈ اسپیس؟ کیا کررہا ہے یہ شخص؟ یہ تو سائنس سے زیادہ مابعدالطبیعات کا موضوع ہے۔ یہ کیا جھمیلا ہے یار؟

ستارے ہیں کہ دروازے کھلے ہیں آسماں کے

مجھے اب دربدر جانا ضروری ہوگیا ہے
بلیک ہولز؟ اینٹری پوائنٹ ٹو دی ادر ڈائمنشن؟ نہیں یار ستارے لکھا ہے۔ تو بلیک ہول سے پہلے کیا تھا؟
جدھر سے آرہا ہے وقت کا خاموش دھارا
رضا میرا ادھر جانا ضروری ہوگیا ہے
نہیں یہ محض اتفاق نہیں۔ ایک ہی غزل میں دو ایسے اشعار؟ یہ شخص جانتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ یہ آگہی کا سفر ہے۔ اس کی آنکھ کو کوئی ایسی جھری مل گئی ہے جس سے یہ ممنوعہ علاقے میں جھانک رہا ہے۔
پھسل گئیں مری آنکھیں پھر آسماں کی طرف
میں اس کے بعد وہیں پر خرام کرنے لگا
اس کے لیے آسمان سر تنی ایک چادر نہیں جس میں ستارے ٹنگے ہیں۔ اس کے بزدیک آسماں ایک لامحدود حقیقت ہے جہاں سے جہان دگر کی راہ داریاں گزرتی ہیں۔ اس کے پاؤں تو زمین پر ہیں، مگر اس کا سفر اس دوسرے جہان کا ہے، جہاں سے خبریں لا لاکر یہ لوگوں کو سنا رہا ہے اور جب وہ نہیں سمجھتے تو یہ جھلاتا۔ الجھتا ہے۔ چیختا ہے۔ سب سے لڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب سے محبت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب اس کے جہان حیرت کے سفر میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ جہان حیرت؟ حیرت؟ کیا یہ کلید ہے اس کی شاعری کا قفل کھولنے کی؟ چلو پھر چلو کتاب کے پہلے صفحے پر۔ حیرت.....
مرے لیے گُل حیرت کھلا ہوا رکھنا
رضا ابھی مرے پاس آنکھ کا پرندہ ہے
منظر سے میں کہتا ہوں کہ حیرت مجھے دے دے
منظر مجھے کہتا ہے نظر کاٹ کے دے دوں
میری جرأت کہ میں حیرت کی کہانی لکھوں
میں الف کی ابھی تفسیر نہیں کرسکتا
اب تک رکا ہوا اسی حیرت کدے میں ہے
لگتا ہے پھر خمار میں آیا نہیں ہے تُو
نئی حیرت تھی اس لیے سب لوگ
رک گئے، اور میں بے خطر گھوما
ہاں ہاں ہاں۔ حیرت۔ اور نئی حیرت۔ سائنس کی تازہ تر دریافتوں سے وا ہونے والی دنیا کی حیرت۔ ایک ایسا طلسم کدہ جس میں ایک بار جھانکنے کے بعد اصل کے سامنے آئینہ بے حیثیت ٹھہرتا ہے۔ یا حیرت۔
کوئی منظر خرید سکتا ہے
مجھ کو حیرت کے ایک دھیلے میں
یہ ہے مسئلہ اس پاگل کا؟ یہ اگہی سے دامن چاک کرکے گھومتا ہے؟ ایسی چاک دامانی کی بخیہ گری جنوں کے بس میں نہیں۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ آگہی کی طلب مزید کھوج ہے۔ اور یہ لگا رہتا ہے اسی کھوج میں۔ کیا واقعی؟ اور دیکھیں؟
شاید اسے کہیں کوئی حیرت دبوچ لے
حدِ نظر سے آگے اچھالی ہوئی ہے آنکھ
حیرت مجھے لگتی ہے کوئی آٹھویں رنگت
یہ رنگ مری آنکھ میں بھرنے کے لیے ہے
گویا یہ سب اتفاق نہیں؟ یہ شخص اٹھویں رنگ کو منظر میں بھرنے اور آٹھواں سُر راگ میں لگانے کی دھن میں تصویر بناتا اور گیت سناتا ہے؟
حیرت کسی صورت مجھے چلنے نہیں دیتی
اور اگلا نظارا مجھے رکنے نہیں دیتا
ہائے ہائے۔ کیسی کشکمش لکھی ہے اس شخص نے۔ ایک طرف حاضر منظر کی گہرائی ہے جو مزید رکنے کا تقاضا کررہی ہے، اور دوسری جانب آگہی کا یہ اعلان ہے کہ آگے چل۔ آگے اور بھی بہت کچھ ہے۔ کتنی مختلف ہے یہ شاعری معلوم کے بیان سے؟ نامعلوم کی پراسراریت، رمزیت، اور ''امکانیت'' ہی اور ہے۔
اکیسویں صدی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، دو اعتبار سے انسانی علم کے مروّجہ قوانین اورؔ اصولوں کی دھجیّاں بکھیر رہی ہے۔ ایک کوانٹم فزکس میں ہونے والی پیش رفت، اور ایک پیراسائکولوجی کا پھیلتا ہوا منظرنامہ۔ یہ دوعلوم اس معلوم دنیا کو ایک یکسر نئی شکل دے رہے ہیں، مگر اس کے چھینٹے اردو غزل میں؟
حیرت ہے رقص میں تجھے کیا دیکھنے کے بعد
اے ذرّے کی دہمال، تجھے کیا مثال دوں؟

یہ وہ ذرّہ نہیں جو اس خاک کا ہوتا ہے جو عاشق کوچۂ محبوب میں اڑاتا پھرتا ہے۔ یہ اس ''الیکٹرون'' کا رقص ہے جو ساری وجودی حقیقتوں کی بنیاد میں جلوہ فرما ہے۔
آنکہیں کھلنے لگی ہیں اب۔ اشعار مزا بھی خوب دے رہے ہیں۔
مری نگاہ تو حیرت سے بات کرتی ہے
سو اس کو روکنا میری زباں پکڑنا ہے
میں ایک شرط پہ آؤں گا بزم یاراں میں
مرے لیے کسی حیرت کا اہتمام کرو
سن لو یارو۔ سمجھ لو کہ رفیع کیوں تمہاری غزلوں کی تعریفوں کے پل نہیں باندھتا؟ اسے حیرت مہیّا کرو۔ پھر دیکھو یہ کیسے ایک چھوٹے بچے کی طرح ہمکتا اور خوش ہوتا ہے اور تمہیں گلے لگاتا ہے۔
یہ جو ہر سمت میں لکھی ہوئی اک نظم سی ہے
اس کے حیرت بھرے اشعار سے باندھا ہوا ہوں
ایک منظر ہے کہ اوجھل ہے مری آنکھوں سے
ایک حیرت ہے کہ میں جس سے لگا پھرتا ہوں
بجھا ہوا کوئی منظر مجھے قبول نہیں
میں اپنی آنکھ سے حیرت نکال پھینکوں گا
عطا ہوا ہے مجھے حیرتوں کا شمس منیر
مری نگاہ نئے منظروں سے روشن ہے
اسے تو کوئی بھی حیرت لگا کے لے جائے
میں اپنی آنکھ کی بے رہ روی سے ڈرتا ہوں
کیسی بے راہ روی ہے جو درست راستے پر لگا دیتی ہے؟ کیسا جہان حیرت وا ہوتا جا رہا ہے۔ سبحان اللہ۔
گم کدے میں حیرتوں کا سلسلہ رکھا گیا
مجھ کو تنہا چھوڑ کر بھی رابطہ رکھا گیا
حیرتی ہوں سو مری کون ضمانت دے گا؟
کوئی منظر بھی مجھے وجد میں لاسکتا ہے
جو شک کا ذائقہ آیا ہے آب زمزم میں
تو کیا یقین کا زمزم نتھارنا پڑے گا؟
ساری حیرت تو مری آنکھ اٹھا لائی ہے
میرے دیکھے ہوئے کو یار کہاں دیکھتے ہیں؟
یہ ہے گلہ۔ یہ ہے مسئلہ۔ حیرت یا اخی حیرت۔
نازل ہوا ہے آنکھ پہ منظر کے سامنے
حیرت نیا فرشتہ ہے اس دین کے لیے
کیا سمجھے؟ نشانیاں۔ عقل والوں کے لیے۔ عقل والوں کا پہلا ردِّ عمل؟ حیرت۔
All knowledge starts with curiosity!
Imagination is more important than knowldge. (Einstein)
کن لوگوں کا ہمسفر ہے یہ شخص؟ دیکھو۔ سمجھو۔
حصار پر گلِ خوبی کے گرد میرا ہے
جسے میں دیدۂ حیران سے بناتا ہوں
تو اس حیرت کے سفر نے کیا دیا رفیع رضا کو؟ ایسے نئے اشعار کہ اب آپ دیدۂ حیرت وا کرکے پڑہیں تو لطف آجائے۔ چلیں میرے ساتھ اس جہان حیرت کے سفر پر۔
اب کسی شعر کی وضاحت میں نہیں کروں گا۔ ہر شعر پر ذرا رکیں اور سوچیں۔ مابعدالطبیعاتی تناظر کو ذہن میں رکہیں اور میرے ساتھ ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں اور رفیع رضا کے لیے دعا کریں۔ اس کے سوالات پر غور کریں کہ سوچنے والے ذہن کا کام محض جوابات سے لطف لینا نہیں، سوال اٹھانا بھی ہے۔ بلکہ سوال اٹھانا ہی ہے۔ یہ بھی دیکھئے گا کہ رفیع مضامین کو کیسے برتتا ہے۔ کیسے ایک مکمل تعقل کے موضوع میں کیفیت پیدا کرتا ہے۔ کیسے اس کا لفظیاتی نظام موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ تمام باتیں الگ الگ مضمون کی متقاضی ہیں، مگر سر دست صرف ان خوبیوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔
یہ پھڑپھڑاتا ہوا شعلہ کھول دے کوئی
بندھا چراغ سے کیوں آنکھ کا پرندہ ہے؟
کہیں کوئی خلا میرے نہ ہونے سے بھی ہوگا
جسے اب مجھ سے بھر جانا ضروری ہوگیا ہے
یہ بتا سکتا ہوں وہ آگ مقدّس ہے مگر

اپنے جلنے کی میں تشہیر نہیں کرسکتا
آسماں سے بھی یقیں اٹھتا چلا جاتا ہے
ایسا ہونا تو نہیں چاہیئے، پر ایسا ہے
ہر طرف آسمان کھلتا ہے
میں کہیں سے فرار نہ ہو جاؤں
میرے ذرّے کو چمکنا ہے اسی نور کے ساتھ
وہ مری خاک سے بچ کر نہیں جانے والا
میں اگر زندہ رہوں گا تو چلا جاؤں گا
میں یہاں سے کبھی مر کر نہیں جانے والا
نئے ہیں لوگ، سوالات بھی نئے لائے
اٹھا یہاں سے پرانا جواب اور نکل
تجھے پتہ ہے بگولے کی آنکھ میں تو ہے
سو اپنے گرد مرا انہماک دیکھنے آ
میں پکارا، کوئی نہیں بولا
پھر مرا خامشی سے دل نہ بھرا
کہیں مثال نہیں ہے کہیں پرندوں میں
کسی الاؤ کے اتنا قریب جانے کی
میں مر رہا ہوں کسی اور زندگی کے لیے
نہیں ہے کوئی ضرورت مجھے بچانے کی
بچے کچھے یہی منظرسمیٹ آنکھوں میں
کوئی ترے لیے کتنے نشان چھوڑے گا؟
کھلا یہ راز کہ وحدت میں کیا بڑائی ہے
میں جب حقیر ہوا جمگھٹوں کے ہونے سے
میں تجھ کو دیکھ چکا اور تجھ کو جان چکا
میں تجھ کو مان چکا آئینے کے ہونے سے
وہ روشنی مری بینائی لے گئی پہلے
پھر اس کے بعد مرا دیکھنا مثال ہوا
میں اس کے سامنے بیٹھا کہ میں جھکوں لیکن
وہ شولہ رُو تو مرا احترام کرنے لگا
تُو کائنات تو کیا، میرے دل پہ بات نہ کر
ترے لیے یہ کہانی ذرا زیادہ ہے
پہلے دیوار کی صورت تھا یہ آئینہ مجھے
اب میں اِس پار سے اُس پار بھی تکنے لگا ہوں
میں اپنی خاک اڑاتا ہوں آسمان تلک
وگرنہ کون سرے سے سرا ملاتا ہے؟
ایسا لگتا ہے کوئی کھول نہیں پایا مجھے
ایسا لگتا ہے بڑے پیار سے باندھا ہوا ہوں
میں پار دیکھ رہا ہوں بڑی سہولت سے
اور آئینے کو یہاں سے ہٹا رہا ہے تُو؟
روک لے ایک گزرتے ہوئے لمحے کو یہیں
شے کوئی جیسے پڑی ہے وہ پڑی رہنے دے
یہ کیسا تعلق ہے سمجھ میں نہیں آتا
کیوں بیچ میں بے انت خلا چھوڑنا پڑ جائے
کہ ایک روز کھُلا رہ گیا تھا آئینہ
اگر گواہ بنوں تو بیان دے دوں کیا؟
میں سامنے سے اٹھا اور لو لرزنے لگی
چراغ جیسے کوئی بات کرنے والا تھا
کہاں یہ خاک کے تودے تلے دبا ہوا جسم
کہاں میں سیر سماوات کرنے والا تھا
دکھا رہے ہو مجھے آسمان کا رستہ
مری اڑان کا آغاز کر رہے ہومیاں
وہ آگیا ہے زیادہ قریب آنکھوں کے
اسی لیے تو ذرا بھی نظر نہیں آتا
جا اپنے آسمان کو خود ہی اٹھا کے پھر

میں تو ہٹا رہا ہوں سہارا دماغ کا
اک سرنگ آنکھ میں لگتی ہوئی پکڑی بروقت
سارے قیدی تھے مری آنکھ سے جانے والے
مرا بدن مجھے اک قید خانہ لگتا ہے
یہاں خبرنہیں کتنا زمانہ لگتا ہے
یہ کیا کیا مجھے اڑنا سکھا دیا تُو نے
اب آسمان بھی مجھ کو پرانا لگتا ہے
لوگ روئے بچھڑنے والوں پر
اور ہم خود کو ڈھونڈ کر روئے
اڑان فرض ہوئی اب مجھے اجازت دو
میں بازوؤں پہ نئے پر نکال بیٹھا ہوں

پر، پرندہ، چراغ، شعلہ، آسمان، اور آنکھ اس جہان حیرت کے سفر میں رفیع کا رختِ سفر ہے۔ یہ اس کے دوسری اقلیم میں داخل ہونے کے پاس ورڈ ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ اپنی شاعری کی تفہیم کرنے پر دوسروں کو مجبور نہیں کرسکتا۔ مگر وہ جانتا ہے یہ وہ ریگ زار ہے جس پر ''تیاری'' کے بغیر قدم دھرا تو پاؤں جل جائیں گے۔ اسی لیے تو وہ کہتا ہے۔۔۔۔

میں نے سب سے کہا رکو، ٹھہرو
دیکھتا ہوں میں جاکے آتش کو

وہ اس پار کا منظر دیکھتا ہے اور اس پار کے لوگوں کو خبر کرتا ہے، مگر وہ لوگ نہیں سمجھتے۔ شاید سمجھیں گے بھی نہیں۔ مگر وہ اس بات سے لاپروا اپنے سفر میں مگن ہے۔ یہ اس کی اپنی دنیا ہے جس میں وہ بلا خوف و خطر گھومتا ہے، منظروں سے حیرت سمیٹتا ہے، لفظوں میں بنتا ہے، اور آگے چل پڑتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ انت سے آگے ایک سفر ہے۔۔۔۔

ایسا نہیں کہ اس کے یہاں کمزوریاں نہیں ہیں۔ بہت ہیں۔ مگر وہ کمزوریاں اس بزدل کی نہیں جو اپنی کمزوریوں پر کھوکھلے لفظوں کا ملمع چڑھاتا رہتا ہے۔ یہ کمزوریاں اس جرأت مند شخص کی ہیں جو اپنے سفر کے دوران ملنےوالی صعوبتوں کو بھی انعام تصور کرتا ہے کیونکہ اس سے اسے حیرت کا خزانہ ملتا ہے۔ فنی کمزوریاں بھی ہیں، مگر وہ کس کے یہاں نہیں ہوتیں؟ اردو شاعری کو جو رفیع رضا سے مل رہا ہے وہ ایک نیا راستہ ہے جس قدم رکھنے سے پہلے وہ رختِ سفر بھی مہیّا کرنا ہوگا جس کے ساتھ نئی منزلوں کی جانب پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ رفیع رضا بڑا شاعر نہیں۔ رفیع رضا عظیم شاعر بھی نہیں۔ مگر رفیع رضا ایک بہت اہم شاعر ہے، جو اگر اپنا سفر جاری رکھے تو ایک دن ان منزلوں تک رسائی پاسکتا ہے جو کم کم لوگوں کا نصیب ہوتی ہیں۔ یہ امکان خود میں ایک بہت بڑی کامیابی ہے اور میں اس کامیابی پر رفیع کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نظر انداز میں ہُوا لیکن
کس قدر ظلم حرف و فن سے ہوا

یہ ظلم رفیع کے نزدیک اسے نظرانداز کرنے کا ظلم نہیں، بلکہ ان لوگوں کا راستہ روکنا کا ظلم ہے جو نئی منزلوں کی دریافت میں رفیع کے ہم سفر ہوسکتے ہیں۔

ابھی بہت سی باتیں رفیع کا آئندہ سفر طے کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ سرِ دست رفیع پر ''صوفی شاعر''، ''سائنسی شاعر'' ''با بعدالجدیدیت کا شاعر'' وغیرہ قسم کے لیبل نہ لگائے جائیں اور اسے اپنا سفر اسی انہماک سے جاری رکھنے دیا جائے، جو اس کے لیے بڑی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اس کی شاعری کا ایک حصہ معاشرتی برائیوں کی عکاسی اور منافقت کے خلاف آواز اٹھانے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں وہ اکثر نعرے بازی کا شکار نظر آتا ہے مگر صاحب۔ احتجاج میں نعرہ تو لگتا ہی ہے، سو یہ بھی ٹھیک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس گوشے پر کسی نہ کسی دوست نے ضرور گفتگو کی ہوگی چونکہ میں نے ابھی باقی مضامین نہیں پڑھے اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا، مگر ایک مختصر تحریر میں ایک اچھے شاعر کا مکمل احاطہ کرنا ناممکن ہے، اس لیے اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ موقع اپنی علمیت جھاڑنے کا نہیں بلکہ ایک خوبصورت شاعر کےکام کو سراہنے کا ہے اس لیے میں نے زیادہ توجہ اس کی شاعری سے اچھے اشعار آپ تک پہنچانے پر دی ہے۔ مگر یہ صرف انتخاب ہے۔

ستارہ لکیر چھوڑ گیا میں اور بہت مال ہے۔

اس مضمون کا مقصد رفیع کی شاعری کے اس گوشے کا قفل کھولنے کی کوشش یا کم ازکم اس کی کنجی مہیّا کرنے کی سعی تھی۔ امید ہے کہ کچھ نہ سہی مگر یہ مضمون رفیع کی شاعری کے اس بڑے حصے کی طرف احباب کی توجّہ ضرور مبذول کرائے گا جو اس کی شاعری کی اصل ہے اور

جہاں سے وہ راستہ نکلتا ہے جو اس کا اصل راستہ ہے۔ اس کی منزل کا راستہ۔ جہان حیرت سے گزرتا ہوا راستہ جہان نامعلوم کی طرف جاتا ہوا راستہ۔
آخر میں رفیع کا وہ مزاج اور رویّہ جو لوگوں کو گراں گزرتا ہے تو صاحبو۔ شاعری جب شاعر کے وجود سے سفر اختیار کرلیتی ہے تو اپنا ایک علیحٰدہ وجود رکھتی ہے۔ اسے اس کی شخصیت سے الگ پرکھو اور اسے اس کا جائز حق دو۔ رہی شخصیت کی بات تو یہ پڑھ لو۔۔
جیسا بھی ہوں سینے سے لگا لو مجھے یارو
اب وقت ذرا کم ہی سدھرنے کے لیے ہے
عرفان ستار
ٹورنٹو
دسمبر ۲۵
۔۲۰۱۰
....
....
NASIR ALI
ناصر علی

ستارہ لکیر چھوڑ گیا۔
رفیع رضاسے میری پہلی ملاقات رحمانپورہ لاہور پر اسی کی دہائی کے وسط میں ہوئی۔صحت مند چہرہ ،رنگ سرخ لیکن سیاہی مائل،شفاف شفاف آنکہیں لیے یہ نوجوان مجھے بہت اچھا لگا ۔چونکہ ہم دونوں تحصیل چنیوٹ سے تہے اس لیے ایک دوسرے سے قریب ہو جانا عین فطری تھا ۔ میں کیریم بہت اچھا کھیلتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ میچ کھیلا۔ ہار جانے پر افسوس کی بجائے اس نے اگلا میچ اور جذبے سے کھیلا۔ کیریم کا بہت اچھا کھلاڑی نہ ہونے کی وجہ سے رفیع رضادوبارہ ہار گیا لیکن بعد ازاںاسے جب بھی موقع ملتا مجھے ہرانے کی کوشش کرتا ۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت پسند آیا کہ یہ شخص مایوس ہونے کی بجائے کوشش پر یقین رکھتا ہے۔اب جب میں اسے مختلف مواقع پرکسی نہ کسی معاملے میں الجھا ہوا دیکھتا ہوںتو مجھے ہار نہ ماننے والا نوجوان رفیع رضا یاد آجاتا ہے ۔
گاہے بگاہے ہم ایک دوسرے ملتے رہے ۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ معاملہ کیسے کھلا کہ ہم دونوں شعر بھی کہتے ہیں لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ رفیع رضانہ صرف اچھے اچھے شعر سناتا تھا بلکہ عروض کے علاوہ دوسرے ٹیکنیکل مسائل پربھی توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ملاقاتوں کا یہ سلسلہ تقریباً چار سال تک قائم رہا اور اس کے بعد اچانک رفیع رضا سے ملاقات ختم ہوگئی کیونکہ اس نے لاہور چھوڑ دیا۔ پھر عرصہ دراز کے بعد میرا یہ دوست فیس بک پر کچھ یوں نمودار ہوا کہ بعد ازاں مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لایا۔سو جب کچھ دن پہلے جب محترم فرحت عباس شاہ صاحب نے حکم دیا کہ رفیع رضا کی شاعری پر مضمون لکھو تو مجھے نہ صرف مسرت بلکہ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا کہ معاملہ ذاتی دوست کا ہے ۔
رفیع کی غزل پر بات کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ شاعری کی بابت اپنا نقطہ ءنظر بیان کر دوں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا لفظ شعور سے مشتق ہے یعنی شعور کا اظہار ۔ لیکن شعر میں شعور کا اظہار ایک خاص سلیقہ بھری بنت سے کیا جاتا ہے ۔ میرے ذاتی خیال میں شعر شعور یعنی بات کا بیان ہے ۔ کچھ دوست شاعری کو صرف تخیل کا اظہارقرار دے کر محدود مضامین کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ جبکہ کافی دوست شعر کو شعور اور تخیل کے ملاپ سے تشکیل پانے والا فن سمجھتے ہیں۔ہو سکتا ہے کہ وہ دوست جو شعر کو صرف تخیل کے اظہار قرار دیتے ہوں اس قضیے سے اختلاف کریں۔ ان دوستوں کا اختلاف سر آنکھوں پر کہ اختلاف ہی زندگی کا حسن ہے۔میں ذاتی طور پر پہلے اور تیسرے بیان سے متفق پا تا ہوں یعنی شعور کا شعری فنی حدود کے اندر رہتے ہوئے با سلیقہ بیان بھی میرے نزدیک شاعری قرار پاتا ہے اور شعور اور تخیل کے ملاپ سے تشکیل پاکربات کا فنی حدود کے اندر رہتے ہوئے با سلیقہ بیان بھی میرے نزدیک شاعری قرار پاتا ہے۔
میرے نظریہ شعر کے ساتھ ساتھ اردو غزل کے سفر پر چند معروضات پیش کرنا ضروری ہے ۔ یہ کہ اردو غزل کلاسیکی شعرا سے سفر کرتی ہوئی جب مولانا حالی تک پہنچی تو حالی نے اسے اسے طے شدہ استعارات و نظام علامات سے نکال کر نئے استعاراتی نظام کی جستجو پر لگا دیا ۔ بعد ازاں غزل اقبال سے ہوتی ہوئی عہدِ موجود تک پہنچی۔اس سفر کے دوران غزل بہت سے لسانی تجربات سے گزری ۔ مضامین کی سطح پر بھی بہت سے اضافے ہوئے۔ایسا بھی ہوا کہ نظم نے 1960کی دہائی میںنصفِ غزل کی موت کا اعلان بھی کیا ۔لسانی تشکیلات کے نعرے کے ساتھ نظم گو حضرات ایک تحریک بنانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ لیکن غزل اتنی سخت جان نکلی کہ ہر مشکل سے نبرد آزماءہوتی ہوئی رفیع رضا جیسے صاحبِ کمال شاعرتک

آپہنچی ہے۔ اس سفر کے دوران غزل مختلف اسالیب سے گزری جن میں اہم طنزیہ و مزاحیہ اسلوب مثلاً اکبر الہ آبادی،تند خوئی مثلاً یگانہ ، اعلی اقدار پر مشتمل اسلوب مثلاً علامہ اقبال،نیم رومانی اسلوب مثلاً فراق،بعد ازاں لسانی تجربات کا ایک سلسلہ بھی چلا۔غز ل میں داستانی اسلو ب کو ثروت حسین جیسے شعرا نے رواج دیا اور کچھ شعرا نے تصوف کے مضامین کی مدد سے ایک نیا اسلوب دریافت کرنے کی کوشش کی جو میرے ذاتی خیال میں ابھی پوری طرح تشکیل نہیں ہو پایا۔اسلوب کے حوالے سے میں رفیع رضا کی غزل پر آخر میںبات کروں گا۔

رفیع رضا ایسا شاعر ہے جو غیر ضروری دباوکے تجربات سے گزرا۔اس دباو کی مختلف اشکال تھیں اور ہیں۔معاشی دباو کے ساتھ ساتھ سیاسی بد حالی اوربعد ازاں ہجرت کا تجربہ ۔ ہجرت کے نتیجے میں بیرون ملک تہذیبی اختلافات نے اور ہی قسم کے دباو جنم دئیے جو صرف ہجرت کرنے والا شخص ہی محسوس کر سکتا ہے۔یوں رفیع رضا جیسا شاعر ان تمام تجربات اور دباو سے گزرتا اور اظہار کا وسیلہ بصورت غزل لیے ہمارے سامنے موجود ہے۔

ستارہ لکیر چھوڑ گیا میں ایک سو پچاس غزلیں موجود ہیں جبکہ اس سے کہیں زیادہ غزلیں کتاب کی ضخامت کے باعث التوا میں ڈال دی گئی ہیں۔میں اس کتاب کی اشاعت کے سفر میں تقریباً ہر مرحلے پر موجود رہا ہوں۔اس دوران میں نے اس کتاب کا ایک ایک شعرکم از کم دو مرتبہ ضرور پڑھا۔کہیں پہلے بھی میں یہ لکھ چکا ہوں کہ رفیع رضا کی غزل نہ صرف تروتازہ لگتی ہے بلکہ یہ غزل کسی استادکی تھپکی کی جتنی پر اثراور نوجوان چہرے جیسی پر جمال ہے ۔کہیں یہ انسانی نفسیاتی تاریخ رقم کرتا نظرؔ تا ہے تو کہیںعلم الکلام کی ساری کتابوں کو شعری ٹھوکر مارتاہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کہیں اس کی غزل انوکھے اظہار سے گزرتی ہے تو کہیں روایت کے ملبے میں مدفون لاشوں پر فاتحہ خوانی اہتمام ہوتا ہے۔ رفیع رضاکی غزل نہ صر ف دل میں کھب جاتی ہے بلکہ اس کی غزل میں وقت بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔رفیع رضا کی غزل میں غزل اور مکالمے کا ملاپ بہت دلچسپ ہے اوراس ملاپ سے یہ بھی سیکھا جا سکتا ہے کہ مصرعے کو اپنی ساخت میں سیدھا کیسے کیا جائے۔ ہر لفظ اتنا موزوں بیٹھتا ہے جیسے غزل نہ ہو گفتگو کی جا رہی ہو۔رفیع رضاکی غزل میں موجود مضامین بوسیدگی کی بو سے بالکل پاک ہوتے ہیں وہ بالکل جگالی نہیں کرتابلکہ اپنے ہونے،کرنے اور بیتی واردات سے غزل کشید کرتا ہے ۔میں کہا کرتا ہوں کہ رفیع رضا بستر پر لیٹ کر ستاروں پر کمند ڈالنے والا شاعر نہیں بلکہ اس کا عمل ہی اس کی شاعری ہے۔یعنی اس کی غزل میں وقت بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

میرے خیال میں مشتمل ہر ردیف غزل کی عمارت قافیے پر نہیں ردیف کے مناسب ترین استعمال پر کھڑی ہوتی ہے ۔ حالانکہ کہ زیادہ تر شعرا دوران نزولِ غزل اور بعد ازاں غزل پر نظر ڈالتے وقت قافیے کی طرف توجہ زیادہ مبذول رکھتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ رفیع قافیہ بندی کے ساتھ ساتھ ردیف پر گہری نظر رکھتا ہے ۔ رفیع رضا کی غزل نہ صرف طے شدہ معیارات پر پوری اتری ہے بلکہ مشکل ترین ردیف کو بھی اتنی سہولت اور ہنرمندی سے استعمال کرتا ہے کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔دور جانے کی ضرورت نہیںمثال کے طور پر اس کتاب کی پہلی پانچ غزلونکی ردیفیں حاضر ہیں۔میں مجھے مل، پرندہ ہے،کاٹ کے دے دوں،سے گرے گا،لگی ہو تم۔ علاوہ ازیں رفیع رضا کی بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف اپنی زمینوں پر کاشت کرتا ہے ۔ اس کے ہاں نئی نئی زمینوں کی دریافت اور ان تخلیقی صلاحیت کو جانچنا زمینوں میں کہی گئی غزلیں اپنی مثال آپ ہیں ۔کسی شاعر کی ہو تو اس کی تخلیق کردہ زمینوں سے اس کے قد کاٹھ کا با آسانی پتا چلایا جا سکتا ہے ۔ رفیع اس معیار پر نہ صرف پورا اترتا ہے بلکہ اس حوالے سے بہت اہم شاعر قرار پاتا ہے۔ آ ئیے اس کی دریافت کردہ زمینوں میں کچھ زمینوں سے لطف اندوز ہوں ۔

غزل کو یاروں نے حجرہ بنا لیا ہوا ہے
ایک مجذوب اداسی میرے اندر گم ہے
بس آنکھ لایا ہوں اور وہ بھی تر نہیں لایا
گزرتے جا رہے ہیں دن، گزارا ہو رہا ہے۔
کچھ نہ کچھ ہونے کا یہ ڈر نہیں جانے والا۔
چاک پر ایسے میرا سر گھوما۔
اے وقت کے امام کہیں میں نہ چل بسوں۔
دن کے اجلے سفید تن سے ہوا۔

رفیع رضا کے ہاں اتنی زیادہ نئی زمینیں ہیں کہ مجھے مشکل ہو رہی ہے کہ کس کس کا ذکر کروں۔ اردو غزل احسان فرموش نہیں ۔ جس شاعر نے اردو غزل کے ساتھ پوری طرح جڑ کر اس کی خدمت کی ،غزل نے اسے یاد رکھا ۔ سواس حوالے سے رفیع رضا کا نام اردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے گا کہ اس نے نئی نئی زمینوں کی دریافت میں بہت اہم کردار ادا کیا ۔

رفیع رضا کا ایک اور اہم کام یہ ہے کہ اس نے روزمرہ زندگی کے مکالماتی انداز کو غزل
کی زبان بنا دیا ہے ۔ اس کا یہ مکالماتی اسلوب اس دور کی ضرورت بھی ہے۔ یہ وہ دور
ہے جس میں فارسی کو سکولوں سے تقریباً خارج کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پرنٹ میڈیا اور
الیکٹرانک میڈیا نے مستعمل زبان کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ
نوجوان کتابی اور شعری اردو سمجھنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے رفیع رضا کا
مکالماتی انداز اور روزمرہ کی زبان میں معیاری اور بہترین غزل بہت اہم کام ہے ۔ بہت
سے شعرا محدود اور مخصوص لفظیات میں مبتلا ہونے کے باعث عام مستعمل زبان سے شعر کشید
کرنے سے قا صر رہتے ہیں۔ شعرا کی اس وجہ سے نوجوان نسل شعر سے دور ہوتی جا رہی ہے ۔
ایسے میں رفیع رضاکی غزل اردو زبان کے لیے تحفہ ہے۔
اردو شاعری میں اضافتوں کے استعمال پر بہت سی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اضافت اظہار کی
سہولت دیتی ہے لیکن ساتھ ساتھ زبان کو بوجھل بھی بنا دیتی ہے ۔ بہت سے شعرا تو ایک
سیدھا مصرعہ نہیں کہہ سکتے۔بعض اوقات تو اردو کی بجائے جناتی زبان بن جاتی ہے۔شعر
کے ایک مصرعے میں دو اضافت فی مصرعہ کا حساب لگائیں تو پانچ اشعار کی غزل میں بیس
عدد اضافیتں موجود ہوتی ہیں ۔ رفیع رضااس معاملے میں بہت سلجھا ہوا رویہ رکھتاہے۔
عام طور پر اس کی غزل اضافت سے پاک ہوتی ہے ۔اگر کہیں ضروری ہو تو اضافت اتنی سہل
ہو کر آتی ہے کہ ذرا بھی بوجھل محسوس نہیں ہوتی۔اس کے ہاں آسان لیکن تازہ اضافت بھی
موجود ہے لیکن مقدار میں بہت کم کیونکہ یہ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتا۔
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ رفیع رضااردگرد کی زندگی اور انسانی تعلقات کو
پوری طرح محسوس کرتا ہے اسی احساس کے تحت وہ اردو شاعری میں روائیت کے اندر رہتے
ہوئے تعلقات میں بہتری کی تلاش میں رہتا ہے۔اس تگ دو نے اس کے شعری اسلوب کو تخلیق
کیا ہے۔ رفیع رضا مسلمات پر اعتبار کرتا ہے لیکن کہیں کہیں انحراف کے رستے بھی نکال
لیتا ہے ۔ میرے خیال میں اس کے اسلوب کے اہم پہلو کچھ یوں ہیں ۔(1) رفیع رضا نے
اردو غزل میں مستعمل اسلوب سے واضح انحراف کرتے ہوئے غزل کو عام فہم بنا دیا ہے
۔(2)رفیع رضا نے نئی شعری علامتوں کو تشکیل دنے کی کوشش کی ہے جو کہ قابل تحسین
ہے۔(3)لسانی سطح پر اردو غزل مشکل پسندی کا شکار تھی۔رفیع رضا نے اسے سیدھے اور
آسان رستے پر ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔(4)موضوعات کی سطح پر بھی اردو غزل
نئے محدودات کا شکار تھی۔ رفیع رضانے غزل کو محدود مضامین سے نکال کر بہت سے
امکانات کا در کھول دیا ہے۔(5) رفیع رضا نے کسی ایک موضوع سے وابستہ نہ رہ کر تمام
زندگی کو شعر کا موضوع بنا کر ثابت کیا ہے کہ غزل کم مایہ اور کمزور وسیلہ اظہار نہ
ہے ۔اگر صلاحیت ہو تو کوئی بھی بات سلیقے سے غزل کا حصہ بنائی جا سکتی ہے آخر میں
کہنا چاہوں گا کہ ہماری رسمی شاعری اس قدر بے ہوش ہو چکی ہے کہ اس کی کائنات ایک
بند کمرے سے زیادہ وسیع نہیں ۔ یہ رفیع رضاجیسے شاعر کا کام ہے کہ اس نے اپنے
اردگرد کواپنی ذات سے علیحدہ کرنے کی بجائے اسے بھی اپنی ذات کا حصہ سمجھا اور بے
ہوش اور رسمی شاعری کو بند کمرے میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے لیے نئے میدان
تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ (ناصر علی مورخہ
-

رفیع رضا ، ایک منفرد اور بلند پرواز پرندہ
تبسم وڑا ئچ صآحب۔

بعض لوگ ادب کی تخلیق کے حوالے سے ادب برائے ادب کا پرچم اٹھائے پھرتے ہیں لیکن اگر
ادب زندہ انسانوں کے حوالہ سے اور زندگی کے کینوس پر رنگ پکھیرنے کے پس منظر کے
ساتھ صورتگری کا حامل ہے تو پھر ادب برائے زندگی اپنے اندر ایک بھرپور معنویت اور
مقصدیت کا پیغامبر ہے ۔
آج مجھے جس تخلیق کار کے فن اور ادبی محاسن پر اپنی معروضات پیش کرنا ہیں وہ بھی
ادب برائے زندگی کے روح پرور نظریہ پر یقین رکھتا ہے ۔ حال ھی میں اس منفرد لب و
لہجہ کے مالک شاعر کا شعری مجموعہ " ستارہ لکیر چھوڑ گیا " کے نام سے منصّۂ شہود پر
آیا ہے ۔ اور شناوران سخنوری سے داد و تحسین سمیٹ رہا ہے ۔
گو کہ میں ابھی مذکورہ کتاب کا جم کے مطالعہ نہیں کر پایا لیکن جتنا بھی مطالعہ کیا
ہے اس کے زریعہ مجھ پر ایک ایسا درِ حیرت وا ھوا ہے کہ جس نے مجھے ایک ایسے رفیع رضا
سے متعارف کروایا ہے جس سے پہلے میں نا آشنا تھا ۔ مجھے اس کتاب کے حوالہ سے رفیع
رضا پیک وقت ایک شاعر،ایک انقلابی، ایک محب وطن، انسان اور انسانیت سے ٹوٹ کر پیار
کرنے والا، زندگی کے تمام رنگوں ، جذبوں اور جہتوں کا صورتگر ، معاشرتی ناہمواریوں

کا شدید نقاد ، طبقاتی استحصال سے نفرت کی حد تک اختلاف رکھنے والا ، تاریخ کی تلخ ترین سچائیوں کا مرثیہ گو ، مذہب کے نام پر پروان چڑھنے والی بدترین منافقتوں کا نوحہ گر ہے ۔ جہاں پر اپنی شاعری کے آئینے میں رفیع رضا اقوام عالم کے حوالے سے بین الاقوامی و عالمی طاقتوں کے استعماری ہتھکنڈوں اور استحصال پرور رویّوں اور منفی امت مسلمہ کی باہمی کمزوریوں ، پالیسیوں پر سراپا احتجاج نظ آتا ہے وہیں پر وہ ریشہ دوانیوں اور استعماری قوتوں کی کاسہ لیسی سے بھی اپنے شدید غم و غصی کا توانا انداز میں اظہار کرتا ہے ۔ رفیع رضا بیک وقت انسانی اجتماعی المیوں کا خطیب بھی ہے اور آنے روشن صبحوں کا نقیب بھی ہے، دکھوں،صدموں اور محرومیوں کا بیانگر بھی ہے اور امیدوں، آرزؤں اور تمنّاؤں کا پیغامبر بھی ۔ آئیے رفیع رضا سے ملتے ہیں ۔

رفیع رضا کی مزکورہ کتاب میں پرندہ اسکے نمائندہ لفظ کے طور پہ واضح نظر آتا ہے ۔ پرندہ جو کہ ایک معصوم اور بے ضرر مخلوق ہے ، امن و آشتی، صلح جوئی اور بلند نگاہی ، وسیع الظرفی اور کشادہ روئی کی علامت ہے ، بلند ہمتی، جہد مسلسل اور نا مساعد حالات کا دلیری اور مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنے کا استعارہ ہے اور یہ لفظ آپ رفیع رضا کی شاعری میں بار بار دیکھیں گے لیکن ہر بار ایک نئے مفہوم اور الگ آہنگ کیساتھ یہ آپکو رفیع کی سوچ دریچوں کی مختلف جہتوں اور زاویوں سے متعارف کراتا ہے ۔ اور شاعر کی سوچ میں پھیلی ہوئی ہمہ گیر وسعتوں اور بیکراں عالم امکانات کا عکّاس ہے ۔ مثالیں اسلئے نہیں دونگا کہ تحریر طوالت کا شکار ہو جائیگی

رفیع محبتوں،چاھتوں اور امن عالم کا علمبردار ہے وہ اس عالمگیر اور آفاقی سچائی کا درس دیتے ہوئے بھی اپنی روایتی عقلیت پسندی اور منطق و استدلال کے جاندار روئیّے کا دامن ھاتھ سے نہیں چھوٹنے نہیں دیتا ۔

طاقت کی یہاں کوئی ضرورت ھی نہیں ہے
نفرت کا درندہ ہے محبّت سے گرے گا

ساتھ ھی وہ اپنے لوگوں میں پروان چڑھنے والی ایسی برائیوں ، معاشرتی خرابیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے مہلک اور تباہ کن اثرات اور نتائج سے اپنے اھل معاشرہ کو خبردار بھی کرتے ہیں

دشمن بھی اسی طاق میں مدّت سے ہے لیکن
یہ گھر مرے اپنوں کی وساطت سے گرے گا

اسی کے ساتھ وہ تاریخی حقائق کے تلخ پہلوؤں سے بھی چشم پوشی کرنے پہ آمادہ نہیں اور بڑے واضح لہجہ میں اسکا اظہار بھی کرتا ہے

اس شہر کی بنیاد میں پہلے بھی لہو تھا
یہ شہر اسی اپنی نحوست سے گرے گا

رفیع رضا ایک صاحب شعور اور صائب الرّائے معاشرتی اکائی ہونے کے حوالے سے معاشرہ میں پائے جانے والی مذہبی روایات کو من و عن بغیر کسی تحقیق و تصدیق کے صرف اندھی عقیدت کے بل بوتے پر تسلیم کرنے کو تیار نیں بلکہ وہ تو بلند بانگ اعلان کرتے ہیں کہ

عجیب لوگ ہیں خود سوچنے سے عاری ہیں
روایتوں کو عقیدہ بنا لیا ہوا ہے

رفیع رضا عالمی امن کے نام نہاد علمبرداروں اور انسانیت کی بھلائی کے جھوٹے دعویداروں کی دوغلی اور منافقانہ بلکہ انسانیت کش جبر و جور پر مبنی ظالمانہ چالوں اور عالمی امن کو سبوتاژ کرنے والی دھشت گرد پالیسیوں کا انتہائی جرآت اور بیباکی سے پردہ چاک کرتے ہیں

کہتا ہے بستیوں کو بسانا ہے اسکا کام
ساری زمیں اجاڑ کے کہتا ہے خوش رھو
آئین لکھتا رھتا ہے امن و امان کا
قرطاس امن پھاڑ کے کہتا ہے خوش رھو
کہتا ہے اب فضا پہ فقط اسکا راج ہے
اور پنکھ سب کے جھاڑ کے کہتا ہے خوش رھو
کہتا ہے اس کے قد کے برابر کوئی نہیں
آئینے توڑ تاڑ کے کہتا ہے خوش رھو

حریّت فکر کا ھر مجاھد دشت کربلا میں حق و باطل کے مابین برپا ہونے والی عظیم ترین معرکہ آرائی میں لشکر الہی کے سپہ سالار حسین ابن علی سے اکتساب فیض اور انکی روایت عشق سے طاقت حاصل کئے بغیر نعرہ ء انالحق لگا ھی نہیں سکتا اور یہی حقیقت رفیع رضا کے ھاں بھی اظہر من الشمس ہے کہ وہ کربلا کی روشنی سے اپنی راہ کا تعیّن کرتے ہیں

منظر سب کاٹنے آتے ہیں مرے نام و نشاں کو
میں ایک دیئے کا انہیں سر کاٹ کے دے دوں

لیکن وہ اس روشن ترین استعارے کا استعمال کس جاندار اور خوبصورت انداز سے فنکارانہ چابکدستی اور مہارت سے کرتے ہیں کہ عقل داد دینے پر مجبور ہو جاتی ہے
ڈھونڈ ھی لیتی ہے نیزے کی طرح کوئی بات
مجھ سے چھپتا ھی نہیں میرا سر ایسا ہے
یہ کتنا بڑا ظلم اور تاریخی بد دیانتی ہے کہ آجتک مسلمانوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ بنا کر پیش کیا جاتا رھا ہے حالانکہ اسلام کی تاریخ شعب ابی طالب ، غار حرا و ثور ، بدر و حنین،خیبر و خندق و احد و کربلا سے روشن ہے جبکہ مسلمانوں کی تاریخ جابر و مستبد حکمرانوں ،حجاج بن یوسف جیسے درندوں اور قاضی ابو یوسف جیسے درباری مولویوں اور مفتیوں سے آلودہ ہے ،رفیع شیخ و شا ہ کے اسی ناباک گٹھ جوڑ پر بلیغ تبصرہ کرتے ہیں
ضرور یہ کوئی ناپاک سا تعلق ہے
جو شیخ و شاہ نے رشتہ بنا لیا ھوا ہے
درج زیل اشعار میں رفیع رضا کی اظہار بیان کے حوالے سے جدّت پسندی ، تنوّع اور انفرادیت بھر پور انداز سے قاری کو اپنی سحر بیانی میں گرفتار کرتی نظر آتی ہے اور یہی لب و لہجہ اسے اپنے ہمعصر شعرا ء سے ممتاز و منفرد ٹھراتی ہے
لوگ روئے بچھڑنے والوں پر
اور ہم خود کو ڈھونڈ کر روئے
واقعی اپنی زات کی تلاش ، اپنی حقیقت کی پہچان اور اپنی سچائی کا عرفان ھی سب سے مشکل مرحلہ ہے اور جب کوئی اس دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرکے اپنی زات سے متعارف ہونے پر احساس زیاں کے سوا کچھ نہ پائے تو پھر آنسو ھی حاصل زندگی قرار پاتے ہیں لیکن پھر یہی آنسو اسکی کامیابیونکا پیش خیمہ ٹہرتے ہیں
مجھے اکیلا حد وقت سے گزرنا ہے

میں اپنے ساتھ کوئی ہمسفر نہیں لایا
کیسے دوں آگ کو ، پانی کو ، ھواؤں کو شکست

اپنی مٹی کو تو تسخیر نہیں کر سکتا
آنسو ہے ، پرندہ ہے ، ستارہ ہے ، فلک ہے

کیا کچھ نہ تری آنکھ کی غفلت سے گرے گا
ہمارے نام سے مشہور ہو رہے ہیں میاں
کئی پہاڑ یہاں طور ہو رہے ہیں میاں
ہم نے اپنے مضمون کے آغاز میں اپنے اس ذہین شاعر کی حب الوطنی اور اپنی دھرتی سے بے پناہ پیار کا زکر کیا تھا ، یہ خوبصورت رویّہ اسکی شاعری میں پوری ادبی وجاھت سے رواں دواں لہو کی گردش اور حرارت کی طرح موجزن ہے ، دیکھیں اس شعر میں دکھ کے احسا س کیساتھ محبت کی چاشنی اور مٹھاس بھی چھلک رھی ہے
کاٹتے رھتے ہیں شاخوں کو مرے دیس کے لوگ
چھاؤں دیتا چلا جاتا ہے شجر ایسا ہے
ھاں یہ دیس ،اسکی فضائیں، اسکی مٹی کی خوشبو اسقدر مہربان ہیں کہ اس کے باسی اپنے ھی دست و بازو نفرتوں اور تعصبات کی بھینٹ چڑھا کر اپنے جسم سے علیحدہ کردیتے ہیں ناقدرئ عالم کی اس سے افسوسناک مثال اور کہیں نہیں ملیگی لیکن یہ بد قسمت دست و بازو اپنے بدن سے کٹ کے ، اپنی دھرتی سے دربدری کی سزا جھیل کر بھی اپنے اسی گم گشتہ بدن کی سلامتی کیلئے بےقرار رھتے ہیں ملٹن کی پیرا ڈائز لاسٹ کیطرح رفیع رضا بھی اپنی گم گشتہ جنّت کا متلاشی ہے ۔
میری دعا ہے کہ خالق قرطاس و قلم افق شعر پہ رفیع رضا کو رفیع الشّان مقام پہ فائز فرمائے اور یہ ستارہ شاعری کے آسمان پر لکیر نہیں روشن تصّورات کی دھنک اور درخشاں امکانات کی کہکشاں چھوڑ کر جائے ، آمین

تبسم وڑا ئچ صآحب۔

خواب میں یا خیال میں مجھے مِل
تُو کبھی خدّ و خال میں مجھے مِل

مرے دل کی دھمال میں مجھے دیکھ
مرے سُر، مری تال میں مجھے مِل

مری مٹی کو آنکھ دی ہے تو پھر
کسی موجِ وصال میں مجھے مِل

مجھے کیوں عرصۂ حیات دیا؟
اب انہی ماہ و سال میں مجھے مِل

کسی صبحِ فراق میں مجھے چھوڑ
کسی شامِ ملال میں مجھے مِل

تُو خود اپنی مثال ہے، وہ تو ہے
اُسی اپنی مثال میں مجھے مِل

ترے شایانِ شاں ہے وصف یہی
کسی وقتِ محال میں مجھے مِل

مرے کل کا پتہ نہیں میری جاں
تُو ابھی مرے حال میں مجھے مِل

یہ خود کشی سے کوئی ماورا پرندہ ہے
جو زرد ہوتا ہُوا اِک ہرا پرندہ ہے

اُڑاتا رہتا ہُوں زخمی پروں کے ساتھ اِسے
مرے لیے مرا حرفِ دُعا پرندہ ہے

یہ پھڑپھڑاتا ہُوا شعلہ کھول دے کوئی
بندھا چراغ سے کیوں آگ کا پرندہ ہے

یہ بے پری، یہ لہو، یہ کراہتی آواز
یہ آئینے میں کوئی دوسرا پرندہ ہے

ہوا تھمی ہے تو پھر شاخ کس طرح لرزی؟
شجر کے دل میں کوئی جاگتا پرندہ ہے

پھڑک رہا ہوں، پرندے مگر بہت خوش ہیں
کہ اُن کے ساتھ کوئی رہنما پرندہ ہے

عجب نہیں کہ کہیں اس کا سانس ٹوٹ گرے
یہ میرا دھیان فضا میں نیا پرندہ ہے

مرے لیے گلِ حیرت کھِلا ہُوا رکھنا
رضاؔ ابھی مرے پاس آنکھ کا پرندہ ہے

کیا وقت سے پہلے ہی ثمر کاٹ کے دے دوں؟
کافی نہ ثمر ہو تو شجر کاٹ کے دے دوں!

منظر سے میں کہتا ہوں کہ حیرت مجھے دے دے
منظر مجھے کہتا ہے نظر کاٹ کے دے دوں

اس واسطے صدیوں کا سفر مَیں نے کیا ہے
یہ جان، تمھیں اتنا سفر کاٹ کے دے دوں

سب کاٹنے آتے ہیں مرے نام و نشاں کو
مَیں ایک دیے کا انہیں سر کاٹ کے دے دوں

لو باندھ لو! مٹی کی روایت سے مجھے بھی
لو ایک پرندہ تمھیں پَر کاٹ کے دے دوں

اک شرط پہ کاٹوں گا چلو ہجر تمہارا
واپس نہ مجھے کرنا اگر کاٹ کے دے دوں

بڑھتی ہُوئی ہر روز کی وحشت سے گرے گا
لگتا ہے ولی اپنی ولایت سے گرے گا

ہم تین ہیں، مَیں ہُوں، یہ زمیں ہے، وہ فلک ہے
ہم میں سے کوئی ٹوٹ کے شدت سے گرے گا

اے سبز شجر بول تجھے کتنا ہلاؤں؟
یہ جسم کا پھل کتنی عبادت سے گرے گا؟

آنسو ہے، پرندہ ہے، ستارہ ہے، فلک ہے
کیا کچھ نہ تری آنکھ کی غفلت سے گرے گا

کیوں سر کو اُٹھا کر تری جانب کوئی دیکھے؟
گرنا ہے تو پھر کون اجازت سے گرے گا

گرتے ہوئے مشکل مجھے پیش آئی تو سوچا
بے جان بدن کتنی سہولت سے گرے گا

اس شہر کی بنیاد میں پہلے بھی لہو تھا
یہ شہر اسی اپنی نحوست سے گرے گا

دشمن بھی اسی تاک میں مدت سے ہے لیکن
یہ گھر مرے اپنوں کی وساطت سے گرے گا

طاقت کی یہاں کوئی ضرورت ہی نہیں ہے
نفرت کا درندہ ہے، محبت سے گرے گا

دشتِ طلب میں پھول کھلانے لگی ہو تم
قوسِ قزح کے رنگ بڑھانے لگی ہو تم

تم نے اُلٹ دیے ہیں محبت کے دو جہان
میں آ نہیں رہا تو بلانے لگی ہو تم

نمناکیءِ رِدائے محبت کو کھول کر
وحشت کی الگنی پہ سُکھانے لگی ہو تم

یہ رحلِ دل پہ کون سا قرآن لا دھرا؟
پڑھنے لگا ہوں مَیں، جو پڑھانے لگی ہو تم

کھڑکی سے دیکھتی ہُوئی کیوں پیچھے ہٹ گئی
کیا روشنی گلی کی بجھانے لگی ہو تم؟

گرتے ہوئے جہانِ تمنا کی خیر ہو
جھکتی ہُوئی نگہ سے اُٹھانے لگی ہو تم

دُھندلا رہا ہے عکس تمھارا اب آنکھ میں
ٹھہرو یہ کس غبار میں آنے لگی ہو تم

نہ کچھ کر کے جو مر جانا ضروری ہو گیا ہے
تو جی میں جو ہے کر جانا ضروری ہو گیا ہے

اجازت دے مجھے دشتِ طلب میں لوٹنے کی
کہ مجھ بے گھر کا گھر جانا ضروری ہو گیا ہے

کسی کی کم نگاہی سے جب آنکھیں بجھ گئی ہیں
تو چہرہ بھی اُتر جانا ضروری ہو گیا ہے!

اگر یونہی رہا حد پر رُکے رہنے کا عالم
تو پھر حد سے گزر جانا ضروری ہو گیا ہے

سمٹنے کی کوئی حد پار کر آیا ہوں کیا میں؟
جو اب میرا بکھر جانا ضروری ہو گیا ہے

کہیں کوئی خلا میرے نہ ہونے کا بھی ہو گا
جسے اب مجھ سے بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

ستارے ہیں کہ دروازے کھلے ہیں آسماں کے
مجھے اب دَر بَدر جانا ضروری ہو گیا ہے

پرانے چاند کی تھکتی ہُوئی اس چاندنی سے
اصولاً دل کا بھر جانا ضروری ہو گیا ہے

جِدھر سے آ رہا ہے وقت کا خاموش دھارا
رضؔا میرا اُدھر جانا ضروری ہو گیا ہے!

غزل کو یاروں نے حجرہ بنا لیا ہوا ہے
اور اپنے شعر کو خطبہ بنا لیا ہوا ہے

پتہ نہیں یہاں بہروپیے زیادہ ہیں
کہ صوفیوں نے یہ حلیہ بنا لیا ہوا ہے

عجیب لوگ ہیں خود سوچنے سے عاری ہیں
روایتوں کو عقیدہ بنا لیا ہوا ہے

خریدنے چلے آئے ہیں آفتاب مرا
اُنہوں نے برف کا سکہ بنا لیا ہوا ہے

ضرور یہ کوئی ناپاک سا تعلق ہے
جو شیخ و شاہ نے رشتہ بنا لیا ہوا ہے

وہ رنگ و نور ہے لیکن بنانے والوں نے
یہاں تو اُس کا بھی چہرہ بنا لیا ہوا ہے

مرا طواف زمیں سے ہے آسمان تلک
اسی کو حج، یہی عمرہ بنا لیا ہوا ہے

پرندے کچھ بھی ہو جھوٹی خبر نہیں لاتے
فقیہِ شہر نے پنجرہ بنا لیا ہوا ہے

زمین والے نے اُجڑی زمین کے اُوپر
نئی زمین کا نقشہ بنا لیا ہوا ہے

اب آنسوؤں کی یہ دیوار بھی نہ گر جائے
لہو نے آنکھ میں رستہ بنا لیا ہوا ہے

ہمارے نام سے مشہور ہو رہے ہیں میاں
کئی پہاڑ یہاں طور ہو رہے ہیں میاں

تو کیا زمین کی خاطر ہلاک ہو جائیں؟
کہ سانحے تو بدستور ہو رہے ہیں میاں

ہمارے یار بس اچھے دنوں کے ساتھی تھے
سو ان دنوں کہیں مفرور ہو رہے ہیں میاں

تمھارے سیم بدن کی قسم اُٹھاتے ہیں
ہم اپنی خاک پہ مغرور ہو رہے ہیں میاں

ہمارا عکس کہاں پتلیوں میں رکھیں گے
جو آئینوں کی طرح چُور ہو رہے ہیں میاں

ضرور دیں گے تمہیں مشورہ محبت کا
تمہارے عشق میں مجبور ہو رہے ہیں میاں

تمہارے وصل کی خواہش ابھی ادھوری ہے
تمہارے ہجر میں بھرپور ہو رہے ہیں میاں

ہم اپنے جسم پہ نشتر چلا کے چھوڑیں گے
تمہارے زخم تو ناسُور ہو رہے ہیں میاں

ہمیں خدائے سخن نے بتا دیا ہے رضؔا
غزل میں ہم یہاں مامور ہو رہے ہیں میاں

لڑائی زور کی تھی جھنڈا گاڑ کر نکلا
میں سب کے سامنے خود کو پچھاڑ کر نکلا

بہت دنوں کی خموشی تھی چیخ کر ٹوٹی
جو خوف تھا مرے اندر سے دھاڑ کر نکلا

بہت سے لوگ تھے جو مجھ کو یاد آنے تھے
سو میں کتاب کے کچھ صفحے پھاڑ کر نکلا

گڑا ہوا بھی نہیں تھا زمیں میں ٹھیک سے میں
ہوا کا زور بھی مجھ کو اُکھاڑ کر نکلا

وہ زور و شور سے آباد کرنے آیا تھا
مگر وہ بستیاں میری اُجاڑ کر نکلا

وہ سب نمائشِ ظاہر پہ فخر کرتے تھے
میں جان بوجھ کے حلیہ بگاڑ کر نکلا

وہ ماہ و سال تو پیچھے ہی پڑ گئے تھے رضاؔ
سو ایک روز میں دامن کو جھاڑ کر نکلا

زمیں کے ساتھ مرا دل جھگڑتا رہتا ہے
اور آسمان کا نقشہ بگڑتا رہتا ہے

یہ روشنی اُسی مجذوب کے لیے تو نہیں
جو آتی جاتی شعاعیں پکڑتا رہتا ہے

لگا ہوا ہے بدن میں جو سانس کا پودا
یہ بار بار یہاں سے اُکھڑتا رہتا ہے

سفر میں دھیان کی جانب سے ہے کچھ آسانی
بدن کا رستہ تو پاؤں پکڑتا رہتا ہے

چمک دمک یہیں رہتی ہے میرے ہونے کی
اُدھر خلا پہ مرا سایہ پڑتا رہتا ہے

وہ قدِ سخن کے شجر کا نکال بیٹھا ہوں
کہ بور اور درختوں پہ جھڑتا رہتا ہے

مرے مزاج کو بخیہ گری نہیں آتی
تعلقات کا دھاگا اُدھڑتا رہتا ہے

کھنڈر کو آنکھ کی ویرانی میں بکھرنا تھا
وہ کم پڑی ہے سو دل میں اُجڑتا رہتا ہے

تھکا دیا مرے ہمزاد نے رضاؔ مُجھ کو
میں ملتا رہتا ہوں اور وہ بچھڑتا رہتا ہے

ایک مجذوب اُداسی مرے اندر گم ہے
اس سمندر میں کوئی اور سمندر گم ہے

بے بسی کیسا پرندہ ہے تمھیں کیا معلوم
اُسے معلوم ہے جو میرے برابر گم ہے

چرخِ سو رنگ کو فرصت ہو تو ڈھونڈے اُس کو
نیلگوں سوچ میں جو مست قلندر گم ہے

دھوپ چھاؤں کا کوئی کھیل ہے بینائی بھی
آنکھ کو ڈھونڈ کے لایا ہوں تو منظر گم ہے

سنگریزوں میں مہکتا ہے کوئی سُرخ گلاب
وہ جو ماتھے پہ لگا تھا وہی پتھر گم ہے

یاد کا ایک دفینہ مرے اندر کہیں تھا
خاک اُڑتی ہے یہاں اور وہ گوہر گم ہے

مجھے جانا ہے، میں تاخیر نہیں کر سکتا
جسم ہرگز مجھے زنجیر نہیں کر سکتا

میں گرا سکتا ہوں دیوارِ بدن کو لیکن
پھر اکیلا اِسے تعمیر نہیں کر سکتا

مری جرأت کہ میں حیرت کی کہانی لکھوں
میں الف کی ابھی تفسیر نہیں کر سکتا

یہ بتا سکتا ہوں وہ آگ مقدس ہے مگر
اپنے جلنے کی میں تشہیر نہیں کر سکتا

پھر مرے دیدہ و دل نے کسے دیکھا ہے بھلا
جب تصور اُسے تصویر نہیں کر سکتا

اے الاؤ! مجھے لکھنے کی اجازت دے دے
ورنہ میں روشنی تحریر نہیں کر سکتا

کیسے دوں آگ کو، پانی کو، ہواؤں کو شکست؟
اپنی مٹی کو تو تسخیر نہیں کر سکتا

رُک بھی جاتا ہے کبھی آنکھ سے ڈھلتا آنسو
دُکھ ہمیشہ یہی تقریر نہیں کر سکتا

بس آنکھ لایا ہوں اور وہ بھی تر نہیں لایا
حوالہ عشق کا مَیں معتبر نہیں لایا

سوائے اس کے تعارف کوئی نہیں میرا
میں وہ پرندہ ہوں جو اپنے پر نہیں لایا

نجانے کس کو ضرورت پڑے اندھیرے میں
چراغ راہ میں دیکھا تھا گھر نہیں لایا

مجھے اکیلا حدِ وقت سے گزرنا ہے
میں اپنے ساتھ کوئی ہم سفر نہیں لایا

گلِ سیاہ کھلا ہے تو رو پڑا ہوں میں
کہ روشنی کا شجر بھی ثمر نہیں لایا

شمار کر ابھی چنگاریاں مرے ناقد
کہ میں الاؤ اُٹھا کے اِدھر نہیں لایا

مری روانی کی اب خیر ہو مرے مالک
ستارہ ٹوٹ کے اچھی خبر نہیں لایا

بھنور نکال کے لایا ہوں میں کنارے پر
مجھے نکال کے کوئی بھنور نہیں لایا

زندوں کو زندہ گاڑ کے کہتا ہے خوش رہو
مردے گڑے اُکھاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

کہتا ہے بستیوں کو بسانا ہے اُس کا کام
ساری زمیں اُجاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

کرتا ہے یوں تو بیٹھ کے سب سے معاملات
ہر اک سے پھر بگاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

آئین لکھتا رہتا ہے امن و امان کا
قرطاسِ امن پھاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

نسلوں کو دے رہا ہے سبق سبزہ زار کا
پھل پھول سارے جھاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

کہتا ہے اُس کے قد کے برابر کوئی نہیں
آئینے توڑ تاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

کہتا ہے اب فضا پہ فقط اُس کا راج ہے
اور پنکھ سب کے جھاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

کہتا ہے دھیمے لہجے میں ہے دوستی کا راز
اور اس کے بعد دھاڑ کے کہتا ہے خوش رہو

مٹی ہے اپنی ذات میں، مٹ جائے گا رضاؔ
لہجے میں جو پہاڑ کے، کہتا ہے خوش رہو

کیا بتائیں کہ کس قدر روئے
عُمر ہنسنے کی تھی مگر روئے

جہاں رونا تھا رو سکے نہ وہاں
اسی خاطر ادھر اُدھر روئے

مشکلیں کم نہیں ہیں رونے میں
کس جگہ کوئی کس قدر روئے

سب کا رونا یہاں برابر ہے
بے ہنر روئے، با ہنر روئے

آنسوؤں پر یہ کیسی پابندی؟
کیا کوئی تم سے پوچھ کر روئے؟

لوگ روئے بچھڑنے والوں پر
اور ہم خود کو ڈھونڈ کر روئے

کوئی چارہ بچا نہیں ہو گا
ورنہ کیوں میرے چارہ گر روئے

ہے خدا جب کہ ہر جگہ موجود
اس سے چھپ کر کوئی کدھر روئے؟

مرے رونے سے کچھ نہیں بدلا
اب کوئی اور معتبر روئے

مجھ پہ حالات کی گردش کا اثر ایسا ہے
گھر پہنچتا ہی نہیں ہوں میں، سفر ایسا ہے

دن بنانے کی مشقت تو کیے جاتا ہوں
کچھ کماتا ہی نہیں ہوں کہ ہنر ایسا ہے

ڈھونڈ ہی لیتی ہے نیزے کی طرح کی کوئی بات
مجھ سے چھپتا ہی نہیں ہے مرا سر ایسا ہے

آسماں سے بھی یقیں اُٹھتا چلا جاتا ہے
ایسا ہونا تو نہیں چاہیے پر، ایسا ہے

کاٹتے رہتے ہیں شاخوں کو مرے دیس کے لوگ
چھاؤں دیتا چلا جاتا ہے، شجر ایسا ہے

کیسے دیوار پہ لکھی ہُوئی تحریر پڑھوں
آنکھ جلتی ہے کہ الفاظ کا شر ایسا ہے

در و دیوار نہ کافی تھے کہ چھت آن گری
آپ ہی آپ بھرا جاتا ہے گھر ایسا ہے

شور گنبد کی طرح سر پہ تنا ہے لیکن
اپنے اندر ہی کُھلا جاتا ہے، دَر ایسا ہے

گزرتے جا رہے ہیں دن، گزارا ہو رہا ہے
جو یکجا ہو گیا تھا پارا پارا ہو رہا ہے

اُفق پر کچھ نہیں دِکھتا سوائے اس لہو کے
میں کیسے مان لوں دن آشکارا ہو رہا ہے

میں لکھتا جا رہا ہوں اور روتا جا رہا ہوں
مرتب زندگی کا گوشوارا ہو رہا ہے

وہ اپنے شہر کے ملبے پہ بیٹھے سوچتے ہیں
تری رحمت کو یہ کیسے گوارا ہو رہا ہے

بہت چمکا مری آنکھوں میں میرا شہر لیکن
غروب آہستہ آہستہ ستارا ہو رہا ہے

در پئے انتشار نہ ہو جاؤں
میں کہیں بے شمار نہ ہو جاؤں

ہر طرف آسمان کھلتا ہے
میں کہیں سے فرار نہ ہو جاؤں

توڑ کر اپنی راہ کی دیوار
آپ اپنا شکار نہ ہو جاؤں

اے تعلق اُدھیڑنے والے
دیکھ میں تار تار نہ ہو جاؤں

کر سکوں آپ اپنے دن کا حساب
صاحبِ اختیار نہ ہو جاؤں؟

چل پڑوں وقت کی طرف تا کہ
وقف ِ لیل و نہار نہ ہو جاؤں

آسماں سب ستارے پھینکتا ہے
میں بھی مُشتِ غُبار نہ ہو جاؤں

سچ کا لہجہ تو تلخ ہوتا ہے
میں کہیں ناگوار نہ ہو جاؤں

کچھ نہ کچھ ہونے کا یہ ڈر نہیں جانے والا
ویسے اس خوف سے میں مر نہیں جانے والا

میرے ذرّے کو چمکنا ہے اُسی نور کے ساتھ
وہ مری خاک سے بچ کر نہیں جانے والا

قوس کی طرح سے آگے فقط اُترائی ہے
اس بلندی سے میں اُوپر نہیں جانے والا

اس تنِ خاک سے نکلی ہے مری دُھوم تو اب
شور یہ لوٹ کے اندر نہیں جانے والا

کبھی ٹوٹا تو سبھی اہلِ نظر دیکھیں گے
میں اُفق سے کوئی چھپ کر نہیں جانے والا

گُلِ آوارگی کیا پورا کھلا ہے اس بار
کیا پلٹ کر میں کبھی گھر نہیں جانے والا؟

میں اگر زندہ رہوں گا تو چلا جاؤں گا
میں یہاں سے کبھی مر کر نہیں جانے والا

یہ جو افلاک کا رستہ لیے جاتا ہے رضاؔ
کبھی لے کر مجھے دَر دَر نہیں جانے والا

ہجر کا کچھ ملال ہے ہی نہیں
یہ محبت کا سال ہے ہی نہیں

دائروں میں کسے ملی منزل
ایسی کوئی مثال ہے ہی نہیں

اس نے لڑ کر امر ہی ہونا ہے
جس کے ہاتھوں میں ڈھال ہے ہی نہیں

چشمِ تر سے سمجھ سکے کوئی
ورنہ لب پر سوال ہے ہی نہیں

تہہ میں طغیانیوں کا زور رہا
سطحِ دل پر اُچھال ہے ہی نہیں

علم خود بھی بڑی مصیبت ہے
اس سے بڑھ کر وبال ہے ہی نہیں

کتابِ سبز پہ رکھ اک گلاب اور نکل
دِکھا، جو دیکھ چکا ہے تُو خواب، اور نکل

تحفظات ہیں اب تک کئی چراغوں کو
اسی اُفق پہ مرے آفتاب اور نکل

ترے جمال کی لَو اب تلک نہیں ابھری
بھنور کی آنکھ سے اے رقصِ آب اور نکل

مری غزل کا یہ حجرہ ہے دھیان کا رستہ
یہاں پہ بحث سے کر اجتناب اور نکل

نئے ہیں لوگ سوالات بھی نئے لائے
اُٹھا یہاں سے پُرانا جواب اور نکل

یہ رولتا ہے کہاں سنگ و خشت میں خود کو
اُٹھا یہ آنکھ، رضاؔ اور خواب اور نکل

خدائے سبز مری زرد خاک دیکھنے آ
یہ کس کا عشق ہوا ہے ہلاک دیکھنے آ

کتابِ نور پہ رکھی ہُوئی نظر سے مل
تُو میرے دھیان کا یہ پہلا طاق دیکھنے آ

تجھے پتہ ہے بگولے کی آنکھ میں تُو ہے
سو اپنے گرد مرا انہماک دیکھنے آ

وہ آگ جو کہ مقدس تھی آ ملی مجھ سے
میں ہو چکا ہوں مکمل، یہ چاک دیکھنے آ

ابھی تلک تو میں اسمِ وجود پڑھتا ہُوں
براہِ نُور مجھے ٹھیک ٹھاک دیکھنے آ

زرد میں خون جلانے سے ہوا
یا ترے چھوڑ کے جانے سے ہوا

کسی بے ہوش کو ہوتا ہو گا
جو مجھے ہوش میں آنے سے ہوا

لہو اطراف کی جانب دوڑا
یہ تجھے ساتھ لگانے سے ہوا

راکھ بنیاد میں، منظر پہ دھواں
اپنی آتش کو دبانے سے ہوا

علم دیوار کے ڈھے جانے کا
میری تصویر ہٹانے سے ہوا

میں گرا، سنگ گرے، خون گرا
ایسا بے پر کی اُڑانے سے ہوا

یہ جو مٹی کا گلا بیٹھ گیا
عمر بھر شور مچانے سے ہوا

عکس در عکس مری آنکھ رہی
تنہا میں آئینہ خانے سے ہوا

نہ سمندر سے اُبھرنا میرا
غلط اندازہ لگانے سے ہوا

دفن ہوتا نہ کھنڈر زندہ کبھی
شہر پر شہر بسانے سے ہوا

میر و غالب بھی ہوئے ہیں لیکن
میں رضؔا اپنے زمانے سے ہوا

میری وارفتگی سے دل نہ بھرا
دیکھ تیرا، خودی سے دل نہ بھرا

دو جہاں سے بھی کیا بڑا ہے یہ
کیوں تری روشنی سے دل نہ بھرا

یوں جلا میں دمِ وصال کہ بس
پھر مرا خودکشی سے دل نہ بھرا

نظم لکھی جو کائنات لکھی
کیا ترا شاعری سے دل نہ بھرا؟

آنکھ اُتنی خوشی سے بھر آئی
میرا جتنی خوشی سے دل نہ بھرا

رکھے رکھی زبان زخموں پر
درد کی چاشنی سے دل نہ بھرا

چار سُو شعلہ رُو کھڑے تھے مگر
اُن کی دریا دلی سے دل نہ بھرا

ہدیۂ لازوال ٹھکرایا
بے پنہ سنسنی سے دل نہ بھرا

میں نے رکھی دُعا ہتھیلی پر
میرا بیچارگی سے دل نہ بھرا

میں پکارا، کوئی نہیں بولا
پھر مرا خامشی سے دل نہ بھرا

تُونے اپنی جگہ جو رکھنی تھی
تُو نے بھی زندگی سے دل نہ بھرا

علم کیا تھا وبالِ جاں تھا رضاؔ
پر مرا آگہی سے دل نہ بھرا

یہ آئینہ مجھے دیوار میں لگانا ہے
اب آنے جانے کا رستہ بھی تو بنانا ہے

اگر چراغ مجھے دیکھتے ہیں حیرت سے
تو اپنا نام انہیں میں نے کیوں بتانا ہے

یہ سنسنی مرے اندر پڑی نہیں رہنی
یہ شور میں نے ترے سامنے مچانا ہے

کسی خلا کی طرح مُجھ میں بڑھ رہا ہے تُو
سو تُجھ کو پانے میں کتنا مجھے گنوانا ہے

میں دائرے کے سفر سے نکلنے والا ہُوں
بتا دے آج مجھے اب کہاں پہ جانا ہے

کشادگی مرے شُعلے کے تھرتھرانے کی
اور اُس پہ تنگ فضا اس قدر زمانے کی

کوئی مثال نہیں ہے کہیں پرندوں میں
کسی الاؤ کے اتنا قریب جانے کی

میں آج دشت کے اُس پار تک نہیں اُترا
بھلا یہ بھی کوئی افواہ تھی اُڑانے کی

کھڑا رہا کہیں محراب میں وُہ سجدے تک
وُہ بے کلی تھی اُسے میرا سر جُھکانے کی

ابھی ابھی جو ستارہ لکیر چھوڑ گیا
سو ہو نہ ہو یہ ہے کوشش مجھے ہرانے کی

کوئی خیال ہمیشہ سفر میں رہتا ہے
سو خواب کرتا ہے کوشش مجھے جگانے کی

اُداس جھیل سی آنکھیں اور اس قدر گہری
مجھے تو پہلے ہی عادت تھی ڈوب جانے کی

میں مر رہا ہوں کسی اور زندگی کے لیے
نہیں ہے کوئی ضرورت مجھے بچانے کی

اب تک جو اعتبار میں آیا نہیں ہے تُو
پھر تو کسی شمار میں آیا نہیں ہے تُو

بس جان کے زیاں پہ ترے ہوش اُڑ گئے
کیا پہلے، کاروبار میں آیا نہیں ہے تُو

اب تک رُکا ہُوا اُسی حیرت کدے میں ہے
لگتا ہے پھر خُمار میں آیا نہیں ہے تُو

وحشت کے بھی اُصول ہیں تُجھ کو خبر نہیں
شاید کہ اس قطار میں آیا نہیں ہے تُو

مٹی بکھیرنے کا یہ موسم نہیں ہے دوست
اچھا ہُوا بہار میں آیا نہیں ہے تُو

لایا گیا تھا گھیر کے تُجھ کو جنوں کے پاس
پھر اپنے اختیار میں آیا نہیں ہے تُو

باہر سے سُن رہا ہے الاؤ کی گُفتگو
در اصل بزمِ یار میں آیا نہیں ہے تُو

گردش ہے تیز تر تو رضاؔ اُس کا کیا گلہ
کیا وقت کے فشار میں آیا نہیں ہے تُو

یہ بات طے ہے رضاؔ جب تُو دھیان کھولے گا
تو اس کے بعد تُجھے تیرا گیان کھولے گا

تُو اپنے نام سے کیسے دُکان کھولے گا
کہ مال اُس کا ہے جس کا جہان کھولے گا

گُھٹا ہُوا ہے ترا سانس تیرے لفظوں میں
تُجھے ابھی ترا حُسنِ بیان کھولے گا

اب اپنے دل پہ لیے جا رہا ہے اس کو تُو
مجھے تو لگتا ہے تُو آسمان کھولے گا

نکلنے دے گا کب آنسو کو آنکھ سے باہر
حدِ ادب پہ کہاں تُو زُبان کھولے گا

دبا اسے ،جو ترا شور تیرے اندر ہے
وگرنہ تُو تو یہاں سب کے کان کھولے گا

تُجھے خبر نہیں رستے میں کس جگہ ہے تُو
یہ راز اور کوئی رازدان کھولے گا

وُہ اس طرف کا رہا اور نہ اُس طرف کا رہا
مکان میں جو حدِ لامکان کھولے گا

بچے کُھچے یہی منظر سمیٹ آنکھوں میں
ترے لیے کوئی کتنے نشان کھولے گا

تُو خُود کو باندھ رہا ہے عجیب جدت سے
رضاؔ تُجھے کوئی اہلِ زُبان کھولے گا

زندگی جتنی اذیت سے کیے جاتا ہُوں
شاعری اُتنی سہولت سے کیے جاتا ہُوں

تُو نے نفرت سے مری جان تو کیا لینا تھی
میں یہی کام محبت سے کیے جاتا ہُوں

دن تو آسان طریقے سے گُزر سکتا تھا
میں ہی بس اس کو مشقت سے کیے جاتا ہُوں

درِ توفیق کے کُھلتے ہی پلٹنا میرا
ہائے کیا کام میں ذلت سے کیے جاتا ہُوں

ایک چلنا ہے کہ کھنچتا ہی چلا جاتا ہُوں
ایک رُکنا ہے کہ طاقت سے کیے جاتا ہُوں

وقت نا وقت کا رونا نہیں روتا ہرگز
جو بھی کرنا ہو میں شدت سے کیے جاتا ہُوں

آگ تُو اتنی مقدس ہے تو آ مُجھ کو جلا
میں نظارہ ترا حسرت سے کیے جاتا ہُوں

ورق کتابِ ازل کا پلٹنے والا ہے
کہ جو جہاں ہے وہاں سے وُہ ہٹنے والا ہے

سو پھیلنے کی اُسی حد پہ عِلم جا کے رُکا
میں کہہ رہا تھا جہاں یہ سمٹنے والا ہے

مری زمین کی تقسیم ہی نہیں ہونی
مرا وجود بھی ہجرت میں بٹنے والا ہے

میں عین وقت پہ نکلا ہجوم سے باہر
مجھے لگا کہ مرا غصّہ پھٹنے والا ہے

ہزار سمت سے آنا ہے میرے لفظوں نے
ابھی غُبار کہاں میرا چھٹنے والا ہے

یہ حاضری کا عقیدہ مرا عقیدہ نہیں
مجھے پتہ ہے مرا نام کٹنے والا ہے

میں چیخ کی طرح منظر پہ جا کے لیٹ گیا
مجھے لگا کوئی اُس پر جھپٹنے والا ہے

فشارِ وقت میں دن گھولتا ہے کُوزہ گر
وُہ میری خاک پہ کیا کیا اُلٹنے والا ہے

نہیں ہے واعظا ہرگز خُدا ترے نزدیک
اسی لیے ترا لہجہ ڈپٹنے والا ہے

ہوا چلی تو مَیں لپکا اُسی کی سمت رضاؔ
اُسے پتہ تو چلے کوئی ڈٹنے والا ہے

چاک پر ایسے میرا سر گُھوما
میں رُکا اور کُوزہ گر گُھوما

نئی حیرت تھی اس لیے سب لوگ
رُک گئے اور میں بے خطر گُھوما

میں رُکا ہی نہیں کہ دیکھوں میں
آسماں پیچھے کس قدر گُھوما

خواب تھا اور وقت کی حد تھی
کیا بتاؤں کدھر کدھر گُھوما

عُمر پُوری گُزار دی لیکن
ایک پل سے بھی مختصر گُھوما

میں نے اُس سے بڑی محبت کی
جو یہاں مُجھ سے پیشتر گھوما

دیکھنے کی کہاں ضرورت تھی
بند آنکھوں سے بے بصر گھوما

سیدھے رستے پہ وُہ نہیں تھے رضاؔ
رہبروں کو میں چھوڑ کر گھوما

میں جی رہا ہُوں ترے معجزے کے ہونے سے
یا مر رہا ہُوں کسی دُوسرے کے ہونے سے

میں خُود تو کُچھ بھی نہیں ہُوں مگر کتاب ازل
پڑھی گئی تُو مرے حاشیے کے ہونے سے

بہت نڈھال رہا اپنے زرد عرصے میں
ہرا ہُوا ہُوں ترے رابطے کے ہونے سے

وُہ سلسلہ، میرا دن بھر طواف کرتا ہے
جو کٹ چکا ہے ترے سلسلے کے ہونے سے

میں کاٹ دُوں ابھی شہ رگ تو کیا رہے گا وُہ
جو ناز ہے تُجھے اس فاصلے کے ہونے سے

تو کیا دُعائیں کروں سانحوں کے ہونے کی
گلے ملے ہیں سبھی سانحے کے ہونے سے

بڑے بڑوں کا بھلا ہو گیا مرے مالک
ترے فقیر ترے سر پھرے کے ہونے سے

کُھلا یہ راز کہ وحدت میں کیا بڑائی ہے
میں جب حقیر ہُوا جمگھٹے کے ہونے سے

میں رو رہا تھا کہ شاید بُھلا دیا گیا ہُوں
میں ہنس پڑا ہُوں نئے حادثے کے ہونے سے

میں تُجھ کو دیکھ چُکا اور تُجھ کو جان چُکا
میں تُجھ کو مان چُکا آئینے کے ہونے سے

دو جہاں مست اپنے میلے میں
اے چراغ آ جلیں اکیلے میں

کوئی منظر خرید سکتا ہے
مجھ کو حیرت کے ایک دھیلے میں

طے کیا مُجھ سے کُچھ کنارے نے
بہہ گیا پھر میں اپنے ریلے میں

ٹانک کر پھول اُس نے بالوں میں
کھول دی آنکھ میری بیلے میں

اک کرن مُجھ کو باندھ کر نکلی
اک شکن سو گئی گدیلے میں

زندگی اُڑ چکی کہیں پیچھے
تتلیاں رہ گئیں میں ٹھیلے میں

ہاتھ میں بُھر بُھرا کے ٹُوٹا ہے
خاک سمٹی ہُوئی تھی ڈھیلے میں

تُو خُود ہی دیکھ دستِ قضا ! تُو نے کیا کیا
بندوں نے یہ کیا تو بتا ! تُو نے کیا کیا

میری نظر بھی ہو گئی اُس سے لہولہان
منظر کو رنگ ایسا عطا تُو نے کیا کیا

دُشمن تو کر رہا ہے جو کرتی ہے دُشمنی
حق اپنی دوستی کا ادا تُونے کیا کیا

اُٹھے ہُوئے یہ ہاتھ بھی گرنے لگے ہیں اب
پلٹی نہیں کسی کی دُعا تُونے کیا کیا

چُپ چاپ میرے سر پہ تنے آسمان دیکھ
اپنی زمین پہ شور بپا تُو نے کیا کیا

''انساں لہو بہائے گا !'' تجھ سے کہا گیا
''میں جانتا ہوں'' ! تُو نے کہا، تُو نے کیا کیا

گرنے دے آنکھ سے یہی آنسو لہو بھرا
سب تُجھ سے پُوچھتے ہیں رضاؔ تُو نے کیا کیا

وُہ علمِ کُل ہے خطا بھی ضرور دیکھتا ہے
تو پھر وُہ حرفِ دُعا بھی ضرور دیکھتا ہے

جو دے رہا ہے نظر کس لیے نہیں آتا
جو لے، وُہ دستِ عطا بھی ضرور دیکھتا ہے

اکیلا میں نہیں موجود کی طرف تکتا
مجھے وہاں سے خلا بھی ضرور دیکھتا ہے

مرے ہُنر کی یہ منطق بڑی نرالی ہے
بُرے میں کوئی بھلا بھی ضرور دیکھتا ہے

شکست کھا کے ہوا ہی اُسے نہیں تکتی
خُود اپنا شُعلہ دِیا بھی ضرور دیکھتا ہے

بس اس میں کوئی آگ ہی سونے کی طرح ہے
ورنہ یہ مری خاک نہ ہونے کی طرح ہے

یہ آنکھ میں روکا ہُوا آنسو ہی نہیں دوست
یہ تو کسی دُنیا کو ڈبونے کی طرح ہے

ہچکی ابھی آواز پہ کرتی ہے بھروسہ
رقّت ابھی اس دور میں رونے کی طرح ہے

میں دھیان میں ڈرتا ہُوں کہیں ٹُوٹ نہ جائے
پرواز کی خواہش بھی کھلونے کی طرح ہے

اک نیند سے اُٹھتا ہُوں نئی نیند کی خاطر
یہ وقت تو خُوش رنگ بچھونے کی طرح ہے

چلتا ہُوں کسی سمت شب و روز اُٹھائے
سامان یہ کُچھ اور ہی ڈھونے کی طرح ہے

کُچھ دیر یہاں شور مچاتا ہُوں غزل کا
یہ گوشئہ چُپ چاپ جو کونے کی طرح ہے

اے وقت کے امام کہیں میں نہ چل بسوں
کر مُجھ سے کُچھ کلام کہیں میں نہ چل بسوں

تیری نہیں ہے بات مرا مسئلہ ہے یہ
تُجھ کو تو ہے دوام کہیں میں نہ چل بسوں

اب ایسے چل چلاؤ میں رُکنا محال ہے
دعوت ہے اتنی عام کہیں میں نہ چل بسوں

گردش میں آ گیا ہے یہ پارا دماغ کا
کُچھ دیر مُجھ کو تھام کہیں میں نہ چل بسوں

رخشِ خیال ہے کہ تری روشنی کے پاس
پھرتا ہے بے لگام کہیں میں نہ چل بسوں

پہلے تو اسمِ خاک سے زندہ رہا ہُوں میں
اب پڑھ کے تیرا نام کہیں میں نہ چل بسوں

سر پر لٹک رہی ہے مگر گرتی کیوں نہیں
شمشیرِ بے نیام ! کہیں میں نہ چل بسوں

اب اپنے چاک پر بھی نظر ڈال کُوزہ گر
میں رہ گیا ہُوں خام ، کہیں میں نہ چل بسوں

حرف کیا ہے ! تجھے نہیں معلوم
یہ خُدا ہے! تجھے نہیں معلوم

یہ جو موجود ہے اسی میں کہیں
اک خلا ہے! تجھے نہیں معلوم

یہ دُعا کی تُو چیر پھاڑ نہ کر
آسرا ہے! تجھے نہیں معلوم

تب کہاں تھا، وُہ اب کہاں پر ہے
پُوجتا ہے! تُجھے نہیں معلوم

شُعلہ تیری طرف جُھکا تو تھا
کیا کہا ہے! تجھے نہیں معلوم

صرف ملبہ گرا ترے سر پر
تُو کھڑا ہے! تجھے نہیں معلوم

زرد کے بعد خُشک بُھورا رنگ
تُو ہَرا ہے ! تجھے نہیں معلوم

عشق کا آخری سفرنامہ
لکھ چُکا ہے! تجھے نہیں معلوم

آگ کس واسطے مقدس ہے
جل رہا ہے! تجھے نہیں معلوم

ٹوٹا پھوٹا، کٹا پھٹا منظر
آنکھ کیا ہے! تجھے نہیں معلوم

عشق کُھلتا نہیں کسی پر بھی
دائرہ ہے! تجھے نہیں معلوم

جنگ میں تیرا آخری ہتھیار
معجزہ ہے! تجھے نہیں معلوم

قبر پر کاہے نام لکھتا ہے
خاک کیا ہے! تجھے نہیں معلوم

روتے روتے یہ کیا ہُوا تُجھ کو
ہنس پڑا ہے! تجھے نہیں معلوم

بُجھتے بُجھتے، جلا کے آتش کو
بچ گیا میں بچا کے آتش کو

چل پڑا اور کُچھ نہیں سوچا
کیا کروں گا میں پا کے آتش کو

زندگی تھی کہ کوئی شُعلہ تھا
میں ملا تھرتھرا کے آتش کو

میں نے سب سے کہا رُکو، ٹھہرو
دیکھتا ہُوں میں جا کے آتش کو

اب گُزرتا ہُوں چور سا بن کر
ہاتھ دایاں، دکھا کے آتش کو

ٹھہر شُعلے! کہاں کو جاتا ہے
اس طرح سے تپا کے آتش کو

میں نے دیکھا کہ کُچھ نہیں بدلا
پھر میں لایا گُھما کے آتش کو

اب الاؤ میں آ گیا ہُوں تو
میں جلوں گا بُجھا کے آتش کو

میں نے بیچی ہے اپنی خاک رضؔا
اور لایا کما کے آتش کو

میں نے رتجگا جو اتنی اُجالی ہُوئی ہے آنکھ
اک بے پنہ دیے سے لڑا لی ہُوئی ہے آنکھ

ایسا سُنہرا رنگ تھا اتنا سُنہرا جسم!
ایسے لگا کہ آگ میں ڈالی ہُوئی ہے آنکھ

شاید اسے کہیں کوئی حیرت دبوچ لے
حدِ نظر سے آگے اُچھالی ہُوئی ہے آنکھ

اُس نے بھی تہہ بہ تہہ کوئی منظر سمو دیا
میں نے بھی چُھپ چُھپا کے نکالی ہُوئی ہے آنکھ

ایسے لگا مجھے کسی تتلی کے پر جھڑے
ایسے لگا غُبار سے خالی ہُوئی ہے آنکھ

دُکھ کا علاج ڈُھونڈ رہا تھا بہاؤ میں
رو رو کے میں نے اور دُکھا لی ہُوئی ہے آنکھ

اندر بلا کا شور ہے باہر خبر نہیں
روشن ہُوا ہے دل رضؔا کالی ہُوئی ہے آنکھ

وُہ جب بھی آتا ہے باہر سے ہو کے جاتا ہے
مگر یہ عشق تو اندر سے ہو کے جاتا ہے

گُریز کرتے ہُوئے ماہتاب کو کیا ہے
کہ میرے جسم کے اُوپر سے ہو کے جاتا ہے

درِ حضور پہ آیا تو یہ کُھلا مُجھ پر
کہ راستہ تو مجاور سے ہو کے جاتا ہے

دھڑکتی رہتی ہے کوئی گھڑی مرے دل میں
یہ وقت میرے ہی چکر سے ہو کے جاتا ہے

میں جھاڑ دیتا ہُوں گردِ سفر کو بالوں سے
ہُما کا سایہ مرے سر سے ہو کے جاتا ہے

زیادہ میں ہی گلے سے اُسے لگاتا ہُوں
اگرچہ حادثہ اکثر سے ہو کے جاتا ہے

کوئی کوئی مرے دل میں قیام کرتا ہے
کوئی کوئی مرے پتھر سے ہو کے جاتا ہے

الگ تھلگ ہے فضا اور الگ تھلگ لہجہ
کوئی کوئی مرے محور سے ہو کے جاتا ہے

مرے سُخن کو کنارے سے دیکھنے والے
ٹھہر! کہاں تُو سمندر سے ہو کے جاتا ہے

یہ میں مثال ہُوا یا، دِیا مثال ہُوا
ہوا کے سامنے جو بھی، رُکا مثال ہُوا

عجیب عالمِ عبرت ہے جبر کے ہاتھوں
وُہ بے زُبان ہے، جس کا کہا مثال ہُوا

وُہ روشنی مری بینائی لے گئی پہلے
پھر اس کے بعد مرا دیکھنا مثال ہُوا

اے دلنشین! تُجھے راز کی بتاؤں میں
جو میری آنکھ میں آیا، گیا، مثال ہُوا

یہ بات میری نہیں بات ہے یہ لوگوں کی
وُہ سو گئے تو مرا جاگنا مثال ہُوا

وُہ جھوٹ بال برابر تھا عکس میں لیکن
چھنک کے ٹوٹ گیا، آئینہ مثال ہُوا

وہیں کہیں پہ کوئی موج پُرسکون ہُوئی
وہیں کہیں پہ مرا ڈوبنا مثال ہُوا

مجھے مثال نہ رحم و کرم کی دی جائے
مرے لیے تو ہر اک سانحہ مثال ہُوا

کسی نے مِلنا تھا شہ رگ کے فاصلے پہ رضاؔ
سو اپنے ہاتھوں گلا کاٹنا مثال ہُوا

دُھواں دُھواں ہی سہی آگ کا نشان تو ہے
کہ میرے بعد اُٹھا میرا خاندان تو ہے

شبِ شکست پرنچے اُڑے بھروسے کے
میں سوچتا تھا مرے سر پہ آسمان تو ہے

یہ جلتا زخم نہ خُود بھی کلام کرنے لگے
کہ میں نے زخم پہ رکھی ہُوئی زُبان تو ہے

مرا کہا جو تری سوچ تک نہیں آتا
کوئی خلا کی طرح اپنے درمیان تو ہے

یہ مُلحدوں نے جو ہجرت کی مُشرکوں کی طرف
وُہ اس لیے کہ زمیں پہ اُنہیں امان تو ہے

جیسے گرے ہُوئے پہ مکاں ٹوٹ کر گرے
سر پر مرے ، زمین و زماں ٹوٹ کر گرے

پارے وُہ روشنی کے مجھے ڈُھونڈتے ہُوئے
میں جس جگہ گرا تھا وہاں ٹوٹ کر گرے

میں ہی نہیں بچا تو ترے آئینے سے کام
میری بلا سے سارا جہاں ٹوٹ کر گرے

آدھی صدی کے خواب کوئی کم نہیں تھے دوست
آخر وُہ سب ستارے کہاں ٹوٹ کر گرے

یہ کون سُن رہا ہے تشدد بھرا جواز
یہ کون کہہ رہا ہے فلاں ٹوٹ کر گرے

ملبہ ہی بیچنا ہے جو بازار میں رضاؔ
کیا فرق کس جگہ سے دُکاں ٹوٹ کر گرے

جو مُجھ کو گھیر رہا ہے وُہ ڈر نکال نہ دُوں
میں اپنے گرد سے دیوار و در نکال نہ دُوں

حسابِ عُمر سے تنگ آ گیا ہوں اب تو میں
یہ ماہ و سال، یہ شام و سحر نکال نہ دُوں

پڑی ہُوئی ہے بہاؤ میں زندگی یُوں بھی
کسی طرف سے میں اپنا بھنور نکال نہ دُوں

میں اور سمت میں اُڑتا ہُوں اور سمت میں تُو
اے روشنی میں ترا اُجلا پر نکال نہ دُوں

ادھر اُدھر جو چمکتی ہے میری خُوش فہمی
تو اپنی خاک سے یہ سارا زر نکال نہ دُوں

پھر اس کے بعد میں دیکھوں کہ دیکھتا کوئی ہے
میں اپنے آپ سے اپنا ہُنر نکال نہ دوں

چراغ پہلے سے بھی معتبر بنا ہُوا ہے
کبھی یہ دل تھا مگر اب نظر بنا ہُوا ہے

یہ آئینہ ہے کہ ٹوٹا ہُوا مرا چہرہ
درونِ ذات عجب اک خبر بنا ہُوا ہے

میں اپنے کام میں تیکھا ہُوں اپنے شوق میں وُہ
میں اُس کی آنکھ ہُوں اور وُہ بھنور بنا ہُوا ہے

مجھے تو پہلے ہی حجرے میں اضطراب سا تھا
اور ان دنوں تو وُہ شیریں ثمر بنا ہُوا ہے

عجیب نقش ہے اُس سے، مرے تعلق کا
دکھائی دیتا نہیں ہے مگر بنا ہُوا ہے

مجھے معاف ہی رکھ مُجھ کو اپنا یار نہ کہہ
یہ حرفِ خیر ابھی حرفِ شر بنا ہُوا ہے

لگا کے زخم وُہ کُچھ اور کام کرنے لگا
مرا لہو مگر اُس سے کلام کرنے لگا

جو تیز دھار چُھری آستین میں رکھّی
اور اس کے بعد اُٹھا، رام رام کرنے لگا

خُدا کا نام لیا اور پھر بھرا ساغر
لو میں شراب کو خُود ہی حرام کرنے لگا

میں اُس کے سامنے بیٹھا کہ میں جُھکوں لیکن
وُہ شُعلہ رُو تو مرا احترام کرنے لگا

میں چند سال میں کیا اتنا ٹُوٹ پُھوٹ گیا
یہ آئینہ تو مرا انہدام کرنے لگا

پھسل گئیں مری نظریں پھر آسماں کیطرف
میں اس کے بعد وہیں پر خرام کرنے لگا

اگرچہ اُس سے خفا تھا مگر نجانے کیوں
میں ایک رات خُدا کو سلام کرنے لگا

کُھلی ہُوئی تھیں مری آنکھیں خواب کے اندر
رضؔا میں سو گیا، قصّہ تمام کرنے لگا

وُہ جو مُجھ سے پرے کا عالم ہے
زرد میں کُچھ ہرے کا عالم ہے

کُچھ میں حیرت پہ آنکھ رکھتا ہُوں
اور کُچھ سانورے کا عالم ہے

انتہا سے پلٹ کے آتا ہُوں
سوچ ، اک دائرے کا عالم ہے

تُجھ کو عالم پہ اختیار نہیں
کیا کسی دوسرے کا عالم ہے

ایسی جُرأت کہ چیخ اُٹّھا ہُوں
کوئی حد سے ڈرے کا عالم ہے

گن رہا ہے کوئی تو سانسوں کو
ہر گھڑی نزخرے کا عالم ہے

بھول جا تو مجھے شکست ہُوئی
یہ مرے پینترے کا عالم ہے

دن کے اُجلے سفید تن سے ہُوا
جاگ اُٹھنا بھی کس کفن سے ہُوا

رُوح پر سُرخیوں میں لکّھا ہے
کیا ہُوا، کیسا تن بدن سے ہُوا

خاک ہے! خاک میں ملاؤ اسے
فیصلہ میرے پیرہن سے ہُوا

پھٹ پڑا اپنے آپ پر جو میں
سالہا سال کی گُھٹن سے ہُوا

میرے اندر چھناک سے ٹُوٹی
آئینہ چُور جس تھکن سے ہُوا

دُکھ میں دیکھو تو ایسے لگتا ہے
آسماں نیلگوں، دُکھن سے ہُوا

بُجھ گئی آنکھ اور پھر میرا
آمنا سامنا کرن سے ہُوا

نظر انداز میں ہُوا لیکن
کس قدر ظلم حرف و فن سے ہُوا

اب خبر دُور تک اُڑے گی رضاؔ
آگ کا رابطہ سُخن سے ہُوا

جا! مرا انہدام ہونے دے
یار! کوئی تو کام ہونے دے

ٹھہر جا راکھ میں ابھی کُچھ ہے
آگ کا اختتام ہونے دے

آنکھ آنسو سے بات کرتی ہے
اس کو محوِ کلام ہونے دے

جاتے جاتے نہ مُڑ کے دیکھ مجھے
شام کے وقت شام ہونے دے

ان کچوکوں سے کون مرتا ہے
عشق کو بے نیام ہونے دے

کارِ دُنیا بہت سمجھتا ہُوں
یہ فسانہ تمام ہونے دے

چاروں طرف سے بند ہُوں خطرہ نہیں گیا
دل سے لگا ہُوا کوئی دھڑکا نہیں گیا

بڑھنے لگا ہُوں آج حدِ وقت کی طرف
ایسے کسی سفر سے مَیں روکا نہیں گیا

میں نے تو روشنی سے بہت دیر بات کی
اُس سے مرا کلام ہی سمجھا نہیں گیا

پہلی کئی دُعائیں مرے دل میں رو پڑیں
پھر مُجھ سے آسمان کو دیکھا نہیں گیا

باہر گلی میں دیکھ لیں چڑیاں مری ہُوئیں
پھر مُجھ سے اپنے صحن میں بیٹھا نہیں گیا

وحشت کو چاہیئے کوئی بے حد کُشادگی
مُجھ سے تو اس زمین پہ ، تڑپا نہیں گیا

یہ جو کنارِ چشم کٹاؤ ہے رنج ہے!
اے دل ! یقین کر ابھی رویا نہیں گیا

حرف و ہُنر کی گٹھڑی سرِعام کُھل گئی
اپنی کمائی لُوٹ کے بھاگا نہیں گیا

چڑھتا ہُوا نشّہ کیا اُترنے کے لیے ہے
کیا خواب مری آنکھ میں مرنے کے لیے ہے

اس بات کو لکھنا ہے سمندر کی لُغت میں
ڈُوبا ہُوا اک جسم اُبھرنے کے لیے ہے

مُجھ سے تُو کبھی خاک ہٹائے تو یہ جانے
آئینہ ترے پاس سنورنے کے لیے ہے

یہ دشتِ محبت کبھی کھولا ہی نہیں تھا
یہ راہ گُزر تیرے گُزرنے کے لیے ہے

اس سارے جہاں کو تو یہ کونا بھی ہے کافی
دل میں جگہ کُچھ اور بھی دھرنے کے لیے ہے

رُکنے سے بھی رُکتی نہیں دھڑکن مرے دل کی
لگتا نہیں پارہ یہ ٹھہرنے کے لیے ہے

شب بھی مری آنکھوں میں لگا لیتی ہے ڈیرہ
اور دن بھی مرے ساتھ بکھرنے کے لیے ہے

حیرت مجھے لگتی ہے کوئی آٹھویں رنگت
یہ رنگ مری آنکھ میں بھرنے کے لیے ہے

جیسا بھی ہُوں سینے سے لگا لو مجھے یارو
اب وقت ذرا کم ھی سُدھرنے کے لیے ہے

اندر کوئی پارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا
باہر وُہ ستارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا

حیرت کسی صُورت مجھے چلنے نہیں دیتی
اور اگلا نظارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا

مٹّی مری تھک ہار کے گرتی ہے زمیں پر
یہ دل کا شرارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا

رُکنے کی تمنّا ہے کہ کھاتی ہے تھپیڑے
چلتا ہُوا دھارا مجھے رُکنے نہیں دیتا

اک بار تری آنکھ میں رُک جاتی ہے ساعت
پھر وقت دوبارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا

اک قوسِ قزح ہے کہ جُھلاتی ہے مرا رنگ
یہ اُس کا بُلارا مجھے رُکنے نہیں دیتا

وُہ پہلی محبت چلی آتی ہے بُلانے
وُہ پہلا خسارہ مجھے رُکنے نہیں دیتا

عشق میں کم کوئی شدت نہیں کی جا سکتی
ورنہ مُجھ سے تو محبت نہیں کی جا سکتی

تھرتھرانا تو ہے شُعلے کی روایت پیارے
ترک مُجھ سے یہ روایت نہیں کی جا سکتی

کیا کسی اور کو دیکھا بھی نہیں جا سکتا
کیا کسی اور پہ حیرت نہیں کی جا سکتی

چاہیے اب کسی حجرے کا بیابان مجھے
ورنہ کُھل کر کوئی وحشت نہیں کی جا سکتی

دیکھ سکتا نہیں ہر وقت میں تیری جانب
مُجھ سے ہر وقت عبادت نہیں کی جا سکتی

شور اندر کا لپٹ جاتا ہے شنوائی سے
مُجھ سے باہر کی سماعت نہیں کی جا سکتی

اب تو ہر سال پتہ اُس کا بدل جاتا ہے
وُہ جو کہتا تھا کہ ہجرت نہیں کی جا سکتی

آئینہ اپنی خراشوں پہ تو بُجھ سکتا ہے
سنگ ریزوں سے شکایت نہیں کی جا سکتی

کرنا پڑ جائے اگر دل کے اندھیرے میں قیام
صاحبِ نُور سے حجت نہیں کی جا سکتی

میری مٹّی کو تو مٹّی سے بدل سکتا ہے
اس سے کم تو مری قیمت نہیں کی جا سکتی

اے حُسنِ بے مثال! تُجھے کیا مثال دُوں
لے آئینہ سنبھال! تُجھے کیا مثال دُوں

تُو رنگِ بے پناہ تُو سر چشمۂ خیال
میں زرد اور نڈھال! تُجھے کیا مثال دُوں

وحشت تو درمیاں کی کوئی آگ ہے حبیب
نے ہجر نے وصال! تُجھے کیا مثال دُوں

بس آ رہا ہُوں تیرے الاؤ کی سمت میں
میری بھلا مجال! تُجھے کیا مثال دُوں

حیرت ہے رقص میں کیا تُجھے دیکھنے کے بعد؟
ذرّے کی یہ دھمال! تُجھے کیا مثال دُوں

میں تُجھ میں کیوں مگن مجھے تیری ہی کیوں لگن
تُو دیکھ میرا حال! تُجھے کیا مثال دُوں

تُجھ سا کوئی جواب کبھی ڈھونڈتا ہے کیا
مُجھ سا کوئی سوال! تُجھے کیا مثال دُوں

تُو روشنی سے کیسے ڈھکے گا مرا وجود
مٹّی پہ مٹّی ڈال! تُجھے کیا مثال دُوں

بات کی اس قدر کھری اک دن
جاں ہتھیلی پہ لا دھری اک دن

میں بضد ہُوں اگرچہ ہے معلوم
سر کٹائے گی خُود سری اک دن

عُمر بھر موسموں سے لڑنا ہے
شاخ جو دیکھ لی ہری اک دن

سب تھے اپنے ضمیر کے قیدی
سب نے خُود کو کیا بری اک دن

عُمر بھر پھر وُہ میرے ساتھ رہی
ملنے آئی تھی بے گھری اک دن

ابتری سارا سال ہوتی ہے
کیوں نہیں ہوتی بہتری اک دن

جس سے میں آسماں کو تکتا تھا
مُجھ سے بولی وہی جھری اک دن

کوئی دکّن سے ملنے آیا تھا
بات کرنی تھی سو ، کری اک دن

نہیں کہ آنکھ میں پانی ذرا زیادہ ہے
ہمارے غم کی روانی ذرا زیادہ ہے

نکلتی جاتی ہے کُچھ تو زمین پاؤں سے
کُچھ آسمان کی ٹھانی ذرا زیادہ ہے

سبھی کے پاؤں میں ہجرت بندھی ہُوئی ہے مگر
ہماری نقل مکانی ذرا زیادہ ہے

ہم اپنے شہر جلاتے ہیں اپنے فتووں سے
ہماری شُعلہ بیانی ذرا زیادہ ہے

یہاں پہ صُبح کا کِھلنا ابھی نہیں مُمکن
یہاں پہ رات کی رانی ذرا زیادہ ہے

تُو کائنات تو کیا میرے دل پہ بات نہ کر
ترے لیے یہ کہانی ذرا زیادہ ہے

میں پھر ملوں گا مجھے آسماں پکڑنا ہے
اور آسمان سے اگلا جہاں پکڑنا ہے

اسے لگا کے، میں بیٹھا ہُوا ہُوں پھندے پر
یہ جان دے کے مجھے اب زماں پکڑنا ہے

بنی ہُوئی ہے فضا میں جو ایک پگڈنڈی
یہ راستہ ہے کہ میں نے دُھواں پکڑنا ہے

اگر چہ زادِ سفر تو یقین ہی ہوگا
مگر کہیں مُجھ کو گُماں پکڑنا ہے

میری نگاہ تو حیرت سے بات کرتی ہے
سو اس کو روکنا میری زُباں پکڑنا ہے

بدن تھماتے ہُوئے یہ نہیں بتایا تھا
تمام عُمر یہ کوہِ گراں پکڑنا ہے

اے میرے خاک بدن پھر کبھی کریں گے کلام
مجھے ابھی کوئی خوابِ رواں پکڑنا ہے

مجھے تو دستِ اجل سے کوئی بھی کام نہیں
اُسے پتہ ہے کہ کس کو کہاں پکڑنا ہے

بہت ہی جاودانی لگ رہی ہے
زمیں بھی آسمانی لگ رہی ہے

یہ میرے عشق کا پہلا ثمر ہے
مجھے جو خُوش گُمانی ''لگ'' رہی ہے

یہ کس کا شُکر واجب ہو گیا ہے
یہ کس کی مہربانی لگ رہی ہے

یہ کوئی پانچواں موسم ہے مُجھ پر
مجھے جو بے کرانی لگ رہی ہے

نئے اس آئینے کو کیا کروں مَیں
مری صُورت پُرانی لگ رہی ہے

یہ سُورج بُجھ رہا ہے جو اُفق میں
مجھے اپنی کہانی لگ رہی ہے

زمیں اپنے ہی چکر میں ہے لیکن
مجھے اپنی روانی لگ رہی ہے

کبھی آنا، دکھاؤں گا تماشا!
مرے گھر لامکانی ''لگ'' رہی ہے

شکستیں کھا رہا ہُوں خُود سے جس میں
یہ میری راجدھانی لگ رہی ہے

میں اپنا سانس تک روکے ھُوئے ہُوں
گلے سے بد گُمانی لگ رہی ہے

دل کو بہتر بنا لیا جائے
اسے پتھر بنا لیا جائے

وُہ جو باہر نہ بن سکا اب تک
اُسے اندر بنا لیا جائے

کسی اُجڑی نگاہ سے مل کر
کوئی منظر بنا لیا جائے

چونکہ پہلے خُدا محبت تھا
اب اُسے ڈر بنا لیا جائے

عُمر گُزری ہے چُپ کے گُنبد میں
شور کا در بنا لیا جائے

سارا الزام اُس پہ دھر دیں گے
کوئی رہبر بنا لیا جائے

ہٹو یہاں سے میاں ! کوئی اور کام کرو
کہ آسماں نہ سُنے اور تُم کلام کرو

لگی ہے دل پہ مگر پار تو نہیں اُتری
تُم اپنی بات ذرا اور بے نیام کرو

میں ایک شرط پہ آؤں گا بزمِ یاراں میں
مرے لیے کسی حیرت کا اہتمام کرو

عجیب لوگ ہو بُنیاد رہنے دیتے ہو
گِرا رہے ہو تو پھر پُورا انہدام کرو

کوئی چراغِ رُخِ یار محترم ہے تو
جہاں بھی دیکھو چراغوں کا احترام کرو

سمیٹنے میں مجھے ساری رات لگنی ہے
بکھر گیا ہُوں مرے دن کا اختتام کرو

یہ ایک چیز ہری رہ گئی ہے ورثے میں
رضاؔ زمینِ سُخن بھی خُدا کے نام کرو

کون کہتا ہے کہ ایمان سے ڈر لگتا ہے
مُجھ کو اللہ کے دربان سے ڈر لگتا ہے

غیر کے ڈر کا وُہ اندازہ لگا سکتا ہے
جس مُسلماں کو مُسلمان سے ڈر لگتا ہے

واعظا! مان لیا میں نے خُدا کو معبود
اب مُسلسل تری گردان سے ڈر لگتا ہے

جھانکتے کیوں نہیں خُود اپنے گریباں میں آپ
آپ کو اپنے گریبان سے ڈر لگتا ہے؟

دیکھئے آپ سے تو کوئی شکایت ہی نہیں
بس ذرا آپ کے ہذیان سے ڈر لگتا ہے

ایک کافور ہی آتا ہے تمھیں سب میں پسند
عنبر و عود سے لوبان سے ڈر لگتا ہے

اپنے شیطان کو چھوڑا ہے زمانے میں کھلا
مولوی کو مرے شیطان سے ڈر لگتا ہے

اُس سے حیوانی کا رُتبہ نہ کہیں چھن جائے
اب تو حیوان کو انسان سے ڈر لگتا ہے

جو دن کے ساتھ نکل کر غروب ہوتا ہُوں
تو اپنے خُون میں ڈھل کر غروب ہوتا ہُوں

غروب ہونے کی کُچھ اور صُورتیں بھی ہیں
مجھے یہ کیا ہے کہ جل کر غروب ہوتا ہُوں

پُکارتا ہے کسی اور کو اُفق لیکن
میں اپنا نام بدل کر غروب ہوتا ہُوں

نہ جانے کون مجھے اتنا پیچھے چھوڑ گیا
میں سارے دشت میں چل کر غروب ہوتا ہُوں

پھر آبِ سُرخ کٹاؤ میں ڈُھونڈتا ہے مجھے
میں آنکھیں زور سے مَل کر غروب ہوتا ہُوں

کسے خبر کہ کسی دن کوئی طلوع نہ ہو
کئی دنوں سے سنبھل کر غروب ہوتا ہُوں

زمین و آسماں کا کیا کیا جائے
اور ان کے درمیاں کا کیا کیا جائے

نہ پُوچھو اُس جہاں سے کیا ہُوا تھا
یہ پُوچھو اِس جہاں کا کیا کیا جائے

زمیں تو کھوکھلی کر دی ہے ہم نے
اور اب سیّارگاں کا کیا کیا جائے

نہ چلنے دے جو اپنے کارواں کو
تو میرِ کارواں کا کیا کیا جائے

ہماری داستاں میں رو پڑی ہے
تُمھاری داستاں کا کیا کیا جائے

اکیلا ہی جسے میں سُن رہا ہُوں
اب اُس شور و فغاں کا کیا کیا جائے

سفر میں اک ستارہ بھی بہت تھا
ہجومِ کہکشاں کا کیا کیا جائے

نتیجہ کُچھ بھی نکلے کُچھ تو نکلے
مسلسل امتحاں کا کیا کیا جائے

مقدس آگ پر ہی مُنحصر ہے!
ہمارے جسم و جاں کا کیا کیا جائے

جسے حیرت نہیں ہے اور شک ہے
اب ایسے بد گُماں کا کیا کیا جائے

نظر آتا ہے سر پر اور نہیں ہے!
رضاؔ اُس آسماں کا کیا کیا جائے

کُھلتا ہے یہ دشت آنکھ جھپکنے کے برابر
میں دیکھتا ہُوں دیکھ نہ سکنے کے برابر

چلتا چلا جاتا ہُوں پر اندیشہ لگا ہے
منزل نہ ملی گر مجھے تھکنے کے برابر

سُننے سے تو خُوشبُو کا تعلق بھی نہیں ہے
کیوں بات وُہ کرتا ہے مہکنے کے برابر

کوشش تو یہ کرتا ہُوں کہ چُھو لُوں مَیں فلک کو
دُوری ہے! مرا ہاتھ جھٹکنے کے برابر!!

اندازہ تری سمت کا ہوتا ہی نہیں ہے
آواز تو آتی ہے دھڑکنے کے برابر!

اُس بندِ قبا میں تو سبھی رنگ تھے لیکن
اک رنگ زیادہ تھا جھجھکنے کے برابر

میں بھی کوئی کم تھا کہ لپٹتا نہ اُسی سے
شُعلہ کوئی لپکا تھا جھڑکنے کے برابر

بینائی کو اب ڈُھونڈتا پھرتا ہُوں رضاؔ میں
بجلی کوئی چمکی تھی اُچکنے کے برابر!

سُورج سا کوئی شام سے پہلے ہی گر گیا
میں اپنے اختتام سے پہلے ہی گر گیا

روتی ہُوئی ہوا نے خبر دیر تک پڑھی
اک چاند اپنے بام سے پہلے ہی گر گیا

اے رابطے کو توڑنے والے ستارہ زاد
یہ گھر ترے قیام سے پہلے ہی گر گیا

حُجرے میں لا چُھپایا ہے تُونے چراغِ راہ
تُو یار کے مقام سے پہلے ہی گر گیا

یکتا کے سامنے مری یکتائی جا پڑی
سجدے میں مَیں امام سے پہلے ہی گر گیا

کہنا تو تھا کہ خُوش ہُوں تمہارے بغیر بھی
آنسو مگر کلام سے پہلے ہی گر گیا

اک ہاتھ تھا دراز رِضا سُوئے آسمان
جو میرے انہدام سے پہلے ہی گر گیا

کس کو درکار ہُوں مٹی کی طرح
یہ جو تیار ہُوں مٹی کی طرح

بھید کھولے کوئی میرا تو کُھلے
میں پُر اِسرار ہُوں مٹی کی طرح

مُجھ میں بھی شوقِ نمو تھا لیکن
اب میں بے کار ہُوں مٹی کی طرح

سر اُٹھاتا ہُوں تو ڈھے جاتا ہُوں
کوئی دیوار ہُوں مٹی کی طرح

چھید آنکھوں کے نہیں بھر سکتا
میں بھی لاچار ہُوں مٹی کی طرح

لیے پھرتے ہیں مجھے آب و ہوا
میں گُنہ گار ہُوں مٹی کی طرح

نہ مرے دیدہءِ نمناک پہ جا
میں اداکار ہُوں مٹی کی طرح

خواب مٹی میں مِلا دیتا ہُوں
میں مددگار ہُوں مٹی کی طرح

تیری خاطر ترے اسباب کو چھوڑ آیا ہُوں
یہ جو مَیں منبر و محراب کو چھوڑ آیا ہُوں

لوٹنے کی کوئی صُورت ہی نہیں ہے اب تو
مَیں ترے خواب میں ہر خواب کو چھوڑ آیا ہُوں

اُس کی لَو کیسے مرے ساتھ لگی چلتی ہے
جو دِیا پچھلے کسی باب میں چھوڑ آیا ہُوں

اے ستارے تُو خسارے میں اکیلا تو نہیں
تُجھ سے پہلے کسی مہتاب کو چھوڑ آیا ہُوں

مجھے زرخیز بنانی ہے یہ بنجر مٹّی
اپنے اندر ترے سیلاب کو چھوڑ آیا ہُوں

اس سے پہلے کہ کوئی اور نکالے مُجھ کو
خود ہی مَیں حلقہ احباب کو چھوڑ آیا ہُوں

اب مجھے حُکم ہے وحشت کی امامت کا رضاؔ
صف لپیٹی ہے اور آداب کو چھوڑ آیا ہُوں

تُجھ الاؤ سے جو باہر کو لپکنے لگا ہُوں
یہ مَیں بُجھنے لگا ہُوں یا کہ بھڑکنے لگا ہُوں

سر پہ سامان زیادہ نہیں رکھنا مُجھ کو
میں مہ و سال کی یہ خاک جھٹکنے لگا ہُوں

جاگتی آنکھ سے چھوڑا تھا مدارِ ہستی
اور اب خواب میں ہر سمت بھٹکنے لگا ہُوں

زیر و بم آن مِلے اور کہیں کے مُجھ میں
اپنی ہستی سے زیادہ میں دھڑکنے لگا ہُوں

پہلے دیوار کی صُورت تھا یہ آ ئینہ مجھے
اب مَیں اِس پار سے اُس پار بھی تکنے لگا ہوں

میں نہیں ڈال سکا وقت کی کھڑکی پہ کمند
اب اسی رسّی کے پھندے سے لٹکنے لگا ہُوں

پَر کہیں مار کے پُہنچا تھا مَیں مرنے کے لیے
اور اب جان بچانے کو پھڑکنے لگا ہُوں

میں محبت کے کسی سبز ستارے کی طرح
راکھ ہو جانے سے کُچھ پہلے چمکنے لگا ہُوں

شل نہ ہو جائے کہیں دیدہءِ حیران رضاؔ
دل میں کھولی ہُوئی یہ آنکھ جھپکنے لگا ہُوں

مُستند نُسخہءِ قُرآن میں تحریف نہ کر
تُو مرے دیدہءِ حیران میں تحریف نہ کر

مسلک و فرقہ و تقلید کو اب چھوڑ پرے
ایسی باتوں سے تو ایمان میں تحریف نہ کر

اپنے اثبات و نفی کو تُو بدل سکتا ہے
اُس کے مابین کے امکان میں تحریف نہ کر

صرف باہر نہیں اندر بھی یہی پھیلا ہے
دُور تک پھیلے بیابان میں تحریف نہ کر

آئینہ ارض و سما کا مَیں لیے پھرتا ہُوں
اس لیے میرے گریبان میں تحریف نہ کر

خاک ہُوں خاک پہ بیٹھا ہُوں پڑا رہنے دے
اے ہوا چھوڑ مری شان میں تحریف نہ کر

زمین روک رہی ہے اُکھڑ رہا ہے کوئی
اور آسماں میں کہیں جڑ پکڑ رہا ہے کوئی

یہ تار تار بکھرتا ہُوا مرا دن ہے
کہ روشنی کا یہ گولہ اُدھڑ رہا ہے کوئی

بُجھے گی پیاس خراشوں سے کیسے مٹی کی
زمیں سے ایڑیاں کاہے رگڑ رہا ہے کوئی

وُہ اپنی ذات کی حیرت میں ہے مگن اتنا
اُسے پتہ بھی نہیں، پاؤں پڑ رہا ہے کوئی

یہ ایک بات تو دُشمن بھی سوچ سکتا ہے
بدن کی ڈھال سے کیوں جنگ لڑ رہا ہے کوئی

حدِ سفر کوئی سنگم ہے ہنسنے رونے کا
کہ مِل رہا ہے کوئی اور بچھڑ رہا ہے کوئی

وُہ بات اُس سے سمیٹی نہ جا سکی تو لگا
کہ جیسے پُھول پہ اک پُھول جھڑ رہا ہے کوئی

سنور رہی ہے غزل جو یہ دن بدن میری
ضرور کام کہیں پر بگڑ رہا ہے کوئی

میں اُس کے ملبے تلے دبتا جا رہا ہُوں رضاؔ
جو شہر آنکھ کے اندر اُجڑ رہا ہے کوئی

دُور تک ہاتھ ہلاتے ہُوئے لوگوں سے ملے
ہم ترے شہر کو جاتے ہُوئے لوگوں سے ملے

کیا خبر کون کہاں پر ہے اکیلا کتنا
ہم تو تنہا نظر آتے ہُوئے لوگوں سے ملے

ایک دن ہم نے خُود اپنے سے بھی کُچھ بات نہ کی
ایک دن شور مچاتے ہُوئے لوگوں سے ملے

اتنے لوگوں سے ملے پھر بھی کسی پر نہ کُھلا
ہم کسے دھیان میں لاتے ہُوئے لوگوں سے ملے

ہم نے بھی دیکھ لیا اپنا مکمل ہونا
ہم بھی دیوار گراتے ہُوئے لوگوں سے ملے

کیسا غُصہ تھا یہ غیروں کا کہ خُود پر نکلا
اپنے ہی گھر کو جلاتے ہُوئے لوگوں سے ملے

ہم اُسی رات کا حصہ تھے سو اوروں کی طرح
صُبحِ بے نُور بناتے ہُوئے لوگوں سے ملے

کوئی عذاب کوئی سانحہ ملاتا ہے
دُکھوں کی سانجھ سے ہم کو خُدا ملاتا ہے

یہ خُوب ہے کہ ہم اک دُوسرے سے ملتے ہیں
مگر یہ کیا کہ ہمیں تیسرا ملاتا ہے

جو ساتھ رہتے ہُوئے بھی بچھڑنے لگتے ہیں
تو اُن دلوں کو کوئی فاصلہ ملاتا ہے

یہ ہوش مند بھی کیا ہیں کہ کھوئے رہتے ہیں
پھر اِن کو اِن سے کوئی سر پھرا ملاتا ہے

خمار اُس کی مُلاقات کا نہیں جاتا
ضرور اس میں وُہ کوئی نشہ ملاتا ہے

میں اپنی خاک اُڑاتا ہُوں آسمان تلک
وگرنہ کون سِرے سے سِرا ملاتا ہے

بغیر لَو کے تو مٹی ہے مُجھ دیے کا وجود
مجھے یہ شُعلہ الاؤ سے جا ملاتا ہے

سویا تو مَیں زماں سے بھی آگے نکل گیا
جاگا تو پھر وہاں سے بھی آگے نکل گیا

خاموش ہو گئی ہے لُغت لامکاں کے بعد
اور مَیں تو لا مکاں سے بھی آگے نکل گیا

وُہ آسماں تھا قوس کی صُورت کھنچا ہُوا
مَیں تیر سا کماں سے بھی آگے نکل گیا

اک چرخِ با زمین تھا اک چرخِ بے زمین
مَیں دونوں ہمرہاں سے بھی آگے نکل گیا

پُوچھا خُدا سے کیسا لگا تیسرا جہان
مَیں فکرِ دو جہاں سے بھی آگے نکل گیا

صدیوں کے قافلے مجھے جاتے ہُوئے مِلے
مَیں اپنے رفتگاں سے بھی آگے نکل گیا

کُچھ دیر دشتِ جاں میں رہا اُس کے ساتھ مَیں
پھر جسمِ ناتواں سے بھی آگے نکل گیا

گونجی تھی ایک دن ردِ توفیق پر صدا
یہ شخص تو زیاں سے بھی آگے نکل گیا

پکڑا گیا تو پُوچھوں گا مَیں اُس سے ایک بات
کیا مَیں تری اماں سے بھی آگے نکل گیا

مَیں لفظ ڈھونڈتا رہا اور وُہ ٹپک پڑا
آنسو مری زُباں سے بھی آگے نکل گیا

پھر کیا ہُوا رضؔا مجھے اس کی خبر نہیں
مَیں اپنی داستاں سے بھی آگے نکل گیا

نقدیِٔ نُور سے پائی نہیں دیتا سائیں
ہر چراغ اپنی کمائی نہیں دیتا سائیں

جوڑتا رہتا ہُوں ٹُوٹی ہُوئی آوازوں کو
شور اتنا ہے سُنائی نہیں دیتا سائیں

تُو بُلاتا ہے مگر بیچ میں رستہ تو لگا
کوئی جاتا بھی دکھائی نہیں دیتا سائیں

باہر اک دشت بتاتا ہے کہ آزاد ہُوں مَیں
کوئی اندر سے رہائی نہیں دیتا سائیں

کسی منظر سے نکل آتی ہے حیرت تیری
تُو مجھے پُوری جُدائی نہیں دیتا سائیں

مَیں کسی پُھول پہ رکھ دیتا ہُوں آنکھیں اپنی
مجھے کُچھ اور سجھائی نہیں دیتا سائیں

تھک گئی مُجھ کو اُڑاتی ہُوئی بے چین ہوا
کوئی مٹّی کو رسائی نہیں دیتا سائیں

میرا کیا کام ترے کارِ جہاں گیری سے
مَیں تو تیری بھی دُھائی نہیں دیتا سائیں

کون کہتا ہے کہ مقدار سے باندھا ہُوا ہُوں
ناقدِ سخت ہُوں معیار سے باندھا ہُوا ہُوں

آپ ٹھہرے ہُوئے منظر سے نکل کر دیکھیں
مَیں یہاں وقت کی رفتار سے باندھا ہُوا ہُوں

یہ جو ہر سمت میں لکھی ہُوئی اک نظم سی ہے
اس کے حیرت بھرے اشعار سے باندھا ہُوا ہُوں

نیند آئے تو کہیں خواب سے آنکھیں کھولوں
مَیں تو معراجِ لگاتار سے باندھا ہُوا ہُوں

صفِ اوّل میں نہیں ہُوں صفِ آخر میں نہیں
میری سرکار ! مَیں سرکار سے باندھا ہُوا ہُوں

ایسے لگتا ہے کوئی کھول نہیں پایا مجھے
ایسے لگتا ہے بڑے پیار سے باندھا ہُوا ہُوں

سبز ہوتی ہُوئی خواہش کی کسی بیل سا مَیں
زرد ہوتے ہُوئے اشجار سے باندھا ہُوا ہُوں

لوگ اُدھر ڈُھونڈ رہے ہیں مرے سائے کا پتہ
مَیں جدھر سایۂ دیوار سے باندھا ہُوا ہُوں

وُہ جو ہجرت کے سفر میں کہیں اُتری ہی نہیں
مَیں پرندوں کی اُسی ڈار سے باندھا ہُوا ہُوں

لَو بچاتے ہیں جہاں نیم رضا مند چراغ
مَیں مُسلسل وہاں اظہار سے باندھا ہُوا ہُوں

سوچیے! رات قیامت تھی! مگر بیت گئی
دیکھئے! صُبح کے اخبار سے باندھا ہُوا ہُوں

آسمان اور زمیں دونوں کنارے ہیں رضؔا
مَیں جہاں ہُوں اُسی منجدھار سے باندھا ہُوا ہُوں

یہ میری لَو ہے جو سب کو دِکھا رہا ہے تُو
عجب چراغ ہے ! مُجھ کو چُرا رہا ہے تُو!

تُو میری فکر نہ کر اپنی کشمکش سے نکل
جلا رہا ہے مجھے یا بُجھا رہا ہے تُو

''ھمارا ایک قبیلہ ہے'' کیا کہا اے دوست
مگر یہ کیا ہے کہ مُجھ کو ہرا رہا ہے تُو

مَیں سچ کہوں تو ترا دل نہ ٹُوٹ جائے کہیں
کٹی پتنگ ہے جس کو اُڑا رہا ہے تُو

میں پار دیکھ رہا ہُوں بڑی سہولت سے
اور آئینے کو یہاں سے ہٹا رہا ہے تُو

یہ جھلملائی ہُوئی سی تھکی تھکی آنکھیں
یہ کہہ رہی ہیں کسی سے خفا رہا ہے تُو

اپنی آواز گنوانے کی ضرورت نہیں ہے
شور میں شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے

بیٹھ جانا ہے کسی دن اسی مٹی کی طرح
اس قدر خاک اُڑانے کی ضرورت نہیں ہے

آن پہنچے گی لگائی ہُوئی ہمسائے میں
گھر کو خُود آگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے

دِن بنایا ہے تو معلوم ہُوا ہے مُجھ کو
یہ ہُنر میرے گھرانے کی ضرورت نہیں ہے

مَیں ٹھہرنے کے ارادے سے ہی آیا ہُوں یہاں
مجھے باتوں میں لگانے کی ضرورت نہیں ہے

ایسے کرتا ہُوں کہ مَیں آنکھیں بُجھا لیتا ہُوں
یار رُک جا! ترے جانے کی ضرورت نہیں ہے

آسماں سے مجھے لانی پڑے مٹی کی خبر
بات کو اتنا بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے

اے تحیر! لے مری نیند بھی اب تُجھ پہ نثار
اب تُجھے خواب میں آنے کی ضرورت نہیں ہے

جا رضا جا، یہ ابھی واعظِ دل سخت سے کہہ
ہمیں پتھر کے زمانے کی ضرورت نہیں ہے

بڑی نازک ہے محبت کی لڑی رہنے دے
درمیان ایک تعلق کی کڑی رہنے دے

ساعتِ وصل کو لے آ مری آنکھوں کی طرف
ساعتِ ہجر مرے دل میں گڑی رہنے دے

رنگ و روغن نہ کُھرچ اب مجھے ایسے نہ کُرید
میرے پتھر پہ کوئی یاد جڑی رہنے دے

آ گِرا دیتے ہیں امکان کی چھت کو لیکن
ایک دیوار یقیں کی تو کھڑی رہنے دے

روک لے ایک گُزرتے ہُوئے لمحے کو یہیں
شے کوئی جیسے پڑی ہے وُہ پڑی رہنے دے

پتے واپس نہ لگا ایسے کہاں لگتے ھیں
شاخ کی بات نہ سُن شاخ جھڑی رہنے دے

تُو نے جانا ہے تو جا ایسے بہانے نہ بنا
نہ دِکھا اپنی کلائی کی گھڑی رہنے دے

تیز رفتاری سے ہلکان تو پہلے بھی ہُوں
نہ اُٹھا اور قیامت کی چھڑی رہنے دے

تنِ تنہا کسی سے لڑنا ہے
اب نہتا کسی سے لڑنا ہے

پہلے جس کی کوئی مثال نہ ہو
مَیں نے ایسا کسی سے لڑنا ہے

وجہ کوئی نہیں ہے لڑنے کی
یُونہی سوچا کسی سے لڑنا ہے

دیکھنا بھی نہیں اُسے مَیں نے
ہو کے اندھا کسی سے لڑنا ہے

دائرے توڑ پھوڑ دینے ہیں
آڑا ترچھا کسی سے لڑنا ہے

وُہ شکایت نہ کر سکے مُجھ سے
کر کے نشہ کسی سے لڑنا ہے

پہلے خُود کو سمیٹ لینا ہے
پھر اکٹھا کسی سے لڑنا ہے

دعوتِ عام ہے چراغوں کو
ایک شُعلہ کسی سے لڑنا ہے

ایک آدھا تو خُود سے اُلجھے گا
باقی آدھا کسی سے لڑنا ہے

لڑ کے آیا ہُوں اس لیے کہ مجھے
اب دوبارہ کسی سے لڑنا ہے

اس لیے بھی مَیں لڑتا رہتا ہُوں
سب سے سستا کسی سے لڑنا ہے

آج مسجد کو جا رہا ہُوں مَیں
کر کے سجدہ کسی سے لڑنا ہے

مَیں نے خُود کو شکست دے دی رضاؔ
مَیں نے اب کیا کسی سے لڑنا ہے

بجی کُھچی ہُوئی اپنی صدا اُٹھاتا ہُوں
سُنا نہیں گیا کوہِ ندا کو جاتا ہُوں

لہو میں بھیگے بدن نے بڑا سُرور دیا
مجھے لگا کہ کسی نُور میں نہاتا ہُوں

یہ بے بسی ہے کہیں جو اُتر نہیں سکتی
کہ بے پری ہے جسے دُور تک اُڑاتا ہُوں

مَیں بن رہا ہُوں کسی حرفِ کُن کے بعد مگر
اب اپنے چاک کو مَیں آپ ہی گُھماتا ہُوں

بنا بنایا وُہ دن مُجھ سے ٹُوٹ جاتا ہے
تمام رات جسے جاگ کر بناتا ہُوں

بندھا ہُوا ہُوں رضاؔ مَیں چراغ کی لَو سے
سو ٹمٹماتا نہیں ہُوں مَیں پھڑپھڑاتا ہُوں

کیا کُچھ یہاں راضی بہ رضا چھوڑنا پڑ جائے
معلوم نہیں اب مجھے کیا چھوڑنا پڑ جائے

ہوسکتا ہے بند آنکھ میں لے جاؤں اسے بھی
ہو سکتا ہے یہ دشت کُھلا چھوڑنا پڑ جائے

بے نام نہ ہو جاؤں مَیں نیچے کہیں جا کر
اُوپر کسی پتھر پہ پتا چھوڑنا پڑ جائے

ہو سکتا ہے بگڑا ہُوا لے جانا پڑے اور
جو کُچھ ہے یہاں اچھا بھلا، چھوڑنا پڑ جائے

یہ کیسا تعلق ہے سمجھ میں نہیں آیا
کیوں بیچ میں بے انت خلا چھوڑنا پڑ جائے

یہ سوچ کے اک بیل اُسے زور سے لپٹی
یہ پیڑ اگر اتنا ہَرا چھوڑنا پڑ جائے

اے دوست تُجھے چھوڑنا ایسے ہے کہ جیسے
شُعلے کو خُود اپنا ہی دِیا چھوڑنا پڑ جائے

ہرگز میرے جینے کا جواز اور نہیں ہے
اِک روز اگر مُجھ کو خُدا چھوڑنا پڑ جائے

اوڑھ کر خاک پہ کُچھ آب و ہَوا پھرتا ہُوں
یہ جو مَیں زرد علاقوں میں ہَرا پھرتا ہُوں

لوگ سُنتے ہی نہیں ٹالتے رہتے ہیں مجھے
وُہ نہیں ہُوں جو یہاں پر مَیں بَنا پھرتا ہُوں

ڈُھونڈتی پھرتی ہے رُخصت کی شبِ تار مجھے
اور مَیں ہُوں کہ چراغوں میں جَلا پھرتا ہُوں

تنگ ہوتے ھیں مری آنکھ میں پھرنے والے
وُہ یہ کہتے ھیں زیادہ مَیں کُھلا پھرتا ہُوں

ایک منظر ہے کہ چمٹا ہے مری آنکھوں سے
ایک حیرت ہے کہ مَیں جس سے لگا پھرتا ہُوں

ہر جگہ ایک زمیں ایک فلک ایک ہی مَیں
مجھے لگتا ہے کہ مَیں ایک جگہ پِھرتا ہُوں

اور اب ساتھ نہیں دیتے مِرا ، یار مِرے
وُہ یہ کہتے ہیں مَیں پہلے ہی بڑا پِھرتا ہُوں

اور اب سنوارنے آئے اُجاڑنے والے
مرے شجر سے مرے برگ جھاڑنے والے

یہ سنگ باز مجھے جو گھسیٹتے لائے
اُگانے والے نہیں ھیں یہ گاڑنے والے

عجب نہیں کہ بکھر جائیں کرچیوں کی طرح
یہ آئینے میں کھڑے ہو کے دھاڑنے والے

گُرو جی! آپ کو مَیں نے یہ گُر سکھایا تھا
جسے لگا کے ہیں مُجھ کو پچھاڑنے والے

سُدھارنے چلے آئے ہیں عاقبت میری
زمیں سے میرا تعلق بگاڑنے والے

تُو اب جو سَر بہ گریباں ہے اے مرے ہمزاد
تو موقع تاڑ رہے ہیں یہ تاڑنے والے

عجیب لوگ تھے آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے رہے
کہاں گئے مرے ناخن اُکھاڑنے والے

بہت دنوں سے رضاؔ مَیں نے موڑ رکھے ہیں
کتابِ یاراں سے کُچھ صفحے پھاڑنے والے

وحشت میں نکل آیا ہُوں ادراک سے آگے
اب ڈھونڈ مجھے مجمعِ عُشاق سے آگے

اک سُرخ سمندر میں ترا ذکر بہت ہے
اے شخص گُزر دیدہءِ نمناک سے آگے

اُس پار سے آتا کوئی دیکھوں تو یہ پُوچھوں
افلاک سے پیچھے ہُوں کہ افلاک سے آگے

دم توڑ نہ دے اب کہیں خواہش کی ہوا بھی
یہ خاک تو اُڑتی نہیں خاشاک سے آگے

جو نقش اُبھارے تھے مٹانے بھی ہیں اُس نے
در پیش پھر اک چاک ہے اس چاک سے آگے

آئینے کو توڑا ہے تو معلوم ہُوا ہے
گُزرا ہُوں کسی دشتِ خطرناک سے آگے

ہمزاد کی صُورت ہے مرے یار کی صُورت
مَیں کیسے نکل سکتا ہُوں چالاک سے آگے

تمہارے ہجر کی ساعت نکال پھینکوں گا
مَیں عشق سے یہ روایت نکال پھینکوں گا

کوئی ستارہ اگر میری راہ میں آیا
تو مَیں یہ مالِ وراثت نکال پھینکوں گا

پروں میں کشف کہاں سے سمیٹ لائی ہے
مَیں آئینے سے یہ صُورت نکال پھینکوں گا

فسادِ خلق مری خانقاہ تک پہنچا
تو مَیں بھی کوئی ولایت نکال پھینکوں گا

سُن اے دریدہ دہن ! میرے پیرہن پہ نہ جا
ابھی میں خاک سے آیت نکال پھینکوں گا

تُو نقدِ جان کا طعنہ نہ دے مجھے پیارے
ترے وصال کی قیمت نکال پھینکوں گا

بُجھا ہُوا کوئی منظر مجھے قبول نہیں
مَیں اپنی آنکھ سے حیرت نکال پھینکوں گا

جو آسمان سے آگے نہ سُن سکے کُچھ بھی
مَیں ایسا ذوقِ سماعت نکال پھینکوں گا

تُم اپنے سانپ بچا لو وگرنہ مَیں بھی رضاؔ
مقابلے میں محبت نکال پھینکوں گا

مَیں ہارنے سے نہیں جیتنے سے ڈرتا تھا
اسی لیے تو کسی معرکے سے ڈرتا تھا

تُجھے پتہ ہے تُجھے کیسے یاد رکھوں گا
دِیا شناس نہیں تھا دیے سے ڈرتا تھا

مجھے نکال دیا تُو نے دل کے مکّے سے
یہ اب کُھلا تُو مجھے ماننے سے ڈرتا تھا

ڈرانے والا تُو پہلا نہیں ہے، یاد رہے
مَیں تُجھ سے پہلے کسی دُوسرے سے ڈرتا تھا

یہ میرا عکس نہیں ہے یہ تیرا چہرہ ہے
مَیں آئینے کے اِسی زاویے سے ڈرتا تھا

قریب آ کے بھی صُورت وُہی ہے ڈرنے کی
مَیں پہلے پہل ذرا فاصلے سے ڈرتا تھا

گلے مِلا ہے تو پہچان بھی نکل آئی
پتہ چلا مَیں اِسی حادثے سے ڈرتا تھا

بہا دیا ہے وُہ آنسو بھی آنکھ سے مَیں نے
کہ جس میں عکس ترا ڈُوبنے سے ڈرتا تھا

مَیں کیسے کھیلنے دیتا تجھے شرارے سے
مَیں سچ کہوں مَیں ترے بچپنے سے ڈرتا تھا

کوئی آفت ہے، مصیبت ہے تو آؤ آؤ
ہم فقیروں کی ضرورت ہے تو آؤ آؤ

آؤ پڑھتے ھیں اُٹھا کے کسی منظر کی حدیث
مسلکِ فقہءِ حیرت ہے تو آؤ آؤ

چاہیے کیا کوئی پرچم کو اُٹھانے والا
یہ اگر عہدِ بغاوت ہے تو آؤ آؤ

لُوٹنے آئے ہو تُم شہرِ محبت، لُوٹو!
کم اگر مالِ غنیمت ہے تو آؤ آؤ

ہم کو شمشیرِ برہنہ سے ڈرانے والو
یہ اگر عشق کی قیمت ہے تو آؤ آؤ

سنگ اُٹھاؤ، چلو آؤ ہمیں سنگسار کرو!
جسم اک جُھوٹی شریعت ہے تو آؤ آؤ

یہ مشیت کا لکھا ماننے والے نہیں ہم
ہاں اگر وقتِ شہادت ہے تو آؤ آؤ

آنکھ سہمی ہُوئی ڈرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے
امن کی فاختہ مَرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

کیا بچا کتنا بچا، تاب کسے ہے دیکھے
موجِ خُوں سر سے گزرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

ایسے لگتا ہے یہاں سے نہیں جانے والی
جو سیہ رات ٹھہرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

دُوسری بار ہُوا ہے کہ یہی دوست ہَوا
پَر پرندوں کے کُترتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

ایک اُجڑی ہُوئی حسرت ہے کہ پاگل ہو کر
بَین ہر شہر میں کرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

موت چمکی کسی شمشیرِ برہنہ کی طرح
روشنی دل میں اُترتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

پھر کنارے پہ وُہی شور وُہی لوگ رضاؔ
پھر کوئی لاش اُبھرتی ہُوئی دیکھی گئی ہے

سمجھ رہی ہے جو دُنیا، نہیں سمجھتا مَیں
مگر کسی کو بھی جھوٹا نہیں سمجھتا مَیں

جہاد کرتا ہُوں اپنے قلم کے ساتھ مگر
کسی دلیل کو جھگڑا نہیں سمجھتا مَیں

یہ درمیان کا پردہ ہے جب اُٹھے سو اُٹھے
اسے بس آنکھ کا پردہ نہیں سمجھتا مَیں

بس ایک بات تُمھاری مجھے پسند نہیں
تمہارے ہجر کو اچھا نہیں سمجھتا مَیں

تمہارے جانے سے کُچھ اور تو نہیں ہوتا
بس اپنے آپ کو پُورا نہیں سمجھتا مَیں

دُعائے وصل کو پڑھ پُھونکتا ہُوں آنکھوں پر
کہاں ہے کون سا موقع، نہیں سمجھتا مَیں

جلا ہُوں آپ تو پھر یہ زُبان سیکھی ہے
کسی چراغ کو گُونگا نہیں سمجھتا مَیں

لہولہان ہو اندر سے کیا پتہ کوئی عکس
اس آئینے کو بھی سچا نہیں سمجھتا مَیں

مُصر ہُوں اپنی دُعاؤں کی کامیابی پر
یہ سَر جُھکانے کو سجدہ نہیں سمجھتا مَیں

جو کائنات مری کُچھ دنوں سے روشن ہے
تو کُچھ فقیروں سے کُچھ سادھوؤں سے روشن ہے

عطا ہُوا ہے مجھے حیرتوں کا شمسِ مُنیر
مری نگاہ نئے منظروں سے روشن ہے

وُہ سب جو قریہءِ حیرت میں ہو گئے پتھر
یہ منطقہ مرے اُن دوستوں سے روشن ہے

میں فاضلانِ محبت سے عرض کرتا ہُوں
یہ خانقاہِ غزل آئینوں سے روشن ہے

طلسمِ خاک نے باندھا ہے جن پرندوں کو
یہ آسمان اُنہیں کے پروں سے روشن ہے

سلام کرتے ہیں ہم دُور سے جنہیں ہر سال
یہ باغِ زُہد اُنہیں برگدوں سے روشن ہے

الاؤ عشقِ مسلسل میں ہو چُکا تقسیم
تمام راستہ اب مشعلوں سے روشن ہے

عظیم نظم لکھی جا رہی ہے اور رضاؔ
نئی ردیفوں نئے قافیوں سے روشن ہے

دیوار ہی نہیں ہے تو در دیکھتا ہے کیا
پاگل ہُوا ہے دشت میں گھر دیکھتا ہے کیا

پتھرا گئی زُبان بھی کیا آنکھ کی طرح
منظر سے کوئی بات بھی کر دیکھتا ہے کیا!

وُہ شہرِ بے اماں تو کہیں راکھ ہو گیا
پلکوں سے اب یہ آنسو اُتر دیکھتا ہے کیا

اے آسمان! پہلے مجھے کُچھ جواب دے
میں تو اِدھر کھڑا ہُوں اُدھر دیکھتا ہے کیا

مٹی سے تُو بنا، تیری مٹی سی تھی اُڑان
اب ٹوٹ کر گرے ہیں تو پر دیکھتا ہے کیا

کیا پوچھتا ہے راہرووں کو تُو روک روک
رستہ کسی کی راہ گُزر دیکھتا ہے کیا

کس ڈور سے بندھا ہے کہ کھنچتا ہے بار بار
مُڑ مُڑ کے رہ کو شہر بدر دیکھتا ہے کیا

موجیں بدن کو چھوڑ کے یہ دیکھنے لگیں
اتنا اُبھر اُبھر کے یہ سر ، دیکھتا ہے کیا

مُرجھا گیا ہے شاخ پہ کب سے کھلا ہُوا
اب اپنے گُل بدن کو شجر دیکھتا ہے کیا

وُہ دیکھنے کی چیز نہیں ماننے کی ہے
پروردگار کو بھی بشر دیکھتا ہے کیا

کیا تُو بھی مِل گیا ہے رضؔا آسمان سے
اتنے سُکوں سے رقصِ شرر دیکھتا ہے کیا

مشغلہ گھر کو بنانا نہیں، گھر توڑنا ہے
اب مرے شہر کے لوگوں کا ہُنر، توڑنا ہے

دن نکلتا ہے فقط فیصلہ کرنے کے لیے
موت کے ہاتھ نے کس شاخ سے سر توڑنا ہے

کون شہروں پہ مرے،گھات لگائے ہوئے ہے
کس نے آسیب کا مکروہ ثمر توڑنا ہے!!

خالی توڑوں تو چھنک مُجھ میں رہے گی مرے دل
ساغرِ درد کو اب درد سے بھر، توڑنا ہے

کھینچتی رہتی ہے اب بھی مجھے تیری جانب
یار ! میں نے تری مٹی کا اثر توڑنا ہے!

جذب میں تُو نہیں کامل تو مرا شعر نہ پڑھ
تُو نے کیا میرا تراشیدہ گُہر توڑنا ہے!!

یہ جو سجدے سے اُٹھا کر لیے جاتا ہے رضؔا
یہ کمر کسنا نہیں پیارے ! کمر توڑنا ہے!!

مَیں اپنی آنکھ کو اس کا جہان دے دُوں کیا
زمین کھینچ لُوں اور آسمان دے دُوں کیا!!

مَیں دُنیا زاد نہیں ہُوں مجھے نہیں منظور
مکان لے کے تمھیں لامکان دے دُوں کیا

کہ ایک روز کُھلا رہ گیا تھا آئینہ
اگر گواہ بنوں تو بیان دے دُوں کیا!!!

اُڑے کُچھ ایسے کہ میرا نشان تک نہ رہے
مَیں اپنی خاک کو اتنی اُڑان دے دُوں کیا

یہ لگ رہا ہے کہ ناخُوش ہو دوستی میں تُم
تمہارے ہاتھ میں تیر و کمان دے دُوں کیا

سمجھ نہیں رہے بے رنگ آنسوؤں کا کہا
انہیں مَیں سُرخ لہو کی زُبان دے دُوں کیا

سُنا ہے زندگی کوئی تہہِ سمندر ہے
بھنور کے ہاتھ میں یہ بادبان دے دُوں کیا

یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے ٹھنڈے دل سے رضاؔ
نہیں بدلتا اگر کُچھ تو جان دے دُوں کیا

کھنکھناتی ہُوئی ہنسی نہ رہی
رہ گیا شہر بَس خُوشی نہ رہی

کوئی چیخا مدد! مدد!! اور پھر
کوئی کھڑکی کہیں کُھلی نہ رہی

صحن اتنے بڑھا لیے سب نے
شہر بھر میں کوئی گلی نہ رہی

قتلِ عالَم اسی کو کہتے ہیں
خواب کی شاخ بھی ہری نہ رہی

تودہءِ خاک جتنا پیاسا تھا
اُس قدر آنکھ میں نمی نہ رہی

چل پڑا مَیں بھی قافلے کی طرح
کمر اتنی مگر کَسی نہ رہی

وَار اُس نے کِیا ہتھیلی پر
خُود کُشی کی لکیر بھی نہ رہی

سکۂ ہجر کہیں اور چلاؤ، جاؤ!
اور معلوم کرو عشق کا بھاؤ، جاؤ!

خیمۂ خواب تعلق سے بندھا ہوتا ہے
کھول کر اس کو کہیں اور لگاؤ، جاؤ

شوق ہے تُم کو چراغ اپنا جلانے کا بہت
لَو ہماری ہی سہی یار! جلاؤ، جاؤ!

تُمھیں معلوم نہیں؟ کیسے مسیحا ہو تُم
وقت بھر دیتا ہے رِستے ہوئے گھاؤ، جاؤ!

طعن و تشنیع یہاں پر تو نہیں بکنے کے
بیچنے والے! دُکان اپنی بڑھاؤ، جاؤ!

کارِ دُشوار نہیں کارِ عبث ہے یہ میاں
بُھول سکتے ہو اگر ہم کو بُھلاؤ، جاؤ

کبھی جو خاک کی تقریبِ رُونُمائی ہُوئی
بہت اُڑے گی وہاں بھی مری اُڑائی ہُوئی

خُدا کا شُکر سُخن مُجھ پہ مہربان ہُوا
بہت دنوں سے تھی لُکنت زُباں میں آئی ہُوئی

یہی ہے غضِّ بصر یہ ہے دیکھنا میرا
رہے گی آنکھ تحیّر میں ڈبڈبائی ہُوئی

تُمھارا میرا تعلق ہے جو رہے سو رہے
تمہارے ہجر نے کیوں ٹانگ ہے اڑائی ہُوئی

پکڑ لیا گیا، جیسے کہ مَیں لگاتا ہُوں
بُجھا رہا تھا کسی اور کی لگائی ہُوئی

لہو لہو ہُوا سجدے میں دل اگرچہ رضاؔ
شبِ شکست بڑے زور کی لڑائی ہُوئی

سُن اے فلک مَیں تری خامشی سے ڈرتا ہُوں
زمیں کے شور میں پھر ہر کسی سے ڈرتا ہُوں

یہ آنکھ شہر کی بُنیاد میں لگی ہُوئی ہے
مَیں رونا چاہتا ہُوں اور نمی سے ڈرتا ہُوں

یہ حادثے بھی عجب ہیں سمجھ نہیں پاتے
یہاں مَیں موت نہیں، زندگی سے ڈرتا ہُوں

تُو آئینے کی طرح ہے مرے غنیم مجھے
ترے بغیر مَیں بے چہرگی سے ڈرتا ہُوں

نہا گیا ہُوں خُود اپنے لہو میں اور ابھی
یہ سُن رہا ہُوں کہ اِس روشنی سے ڈرتا ہُوں

اسے تو کوئی بھی حیرت لگا کے لے جائے
مَیں اپنی آنکھ کی بے رہروی سے ڈرتا ہُوں

وُہ کس کا خوف تھا جس نے مجھے دلیر کیا
کسی سے ڈرتا نہیں، بُزدلی سے ڈرتا ہُوں

دُعائیں پڑھتے ہُوئے اس بدن سے نکلوں گا
پھر اس زمین کے بُھورے کفن سے نکلوں گا

اُتار پھینکوں گا خاکستری لبادے کو
مَیں ایک عُمر کی لمبی تھکن سے نکلوں گا

مجھے نکلنا ہے آگے اور اس سے آگے بھی
زمیں کے بعد مَیں نیلے گگن سے نکلوں گا

نہ روک پائے مجھے کوئی روکنے والا
ستارہ تھام کے اس بانکپن سے نکلوں گا

حروف کشف سے آگے کی بات لائیں گے
ضرور مَیں کسی شیریں دَہن سے نکلوں گا

مجھے اُتار لیا تُو نے اپنے شیشے میں
مَیں جان ہُوں ترے شیشے کی، چِھن سے نکلوں گا

پھر اس کے بعد مَیں روشن رہوں کہ بجھ جاؤں
پر ایک بار تو پُوری اگن سے نکلوں گا

یہ بیکرانی مجھے روکنے لگی ہے مگر
مَیں اس کے پار رضاؔ اپنے فن سے نکلوں گا

یہ جو اتنا لو سے لو کا فاصلہ رکھا گیا
یہ مرا ہمزاد تھا مُجھ سے جُدا رکھا گیا

گُم کدے میں حیرتوں کا سلسلہ رکھا گیا
مُجھ کو تنہا چھوڑ کر بھی رابطہ رکھا گیا

روشنی کے قُمقُمے سُوئے فلک چھوڑے گئے
گُھپ اندھیرے میں مرا پُورا پتہ رکھا گیا

اک دُعا لپٹی رہی میرے تنِ پُر خواب سے
رُت اگرچہ زرد تھی پر میں ہرا رکھا گیا

ایک مدت تو اُسے مانوس کرنے میں لگی
آنکھ پُوری جل اُٹھی جب تو دیا رکھا گیا

میرے باہر کھوٹ کا بازار زوروں پر رہا
میری قیمت کیا لگے میں تو کھرا رکھا گیا

یاد کرنا تھا کسی کو ہنسنے رونے میں رضاؔ
در حقیقت اس لیے نامِ خُدا رکھا گیا

کرتا رہُوں گا حمد و ثنا سخت کافرم
''گر کُفر ایں بَوَد بخُدا سخت کافرم''

سنگسار کر رہے ہیں مُسلمان میرا دل
سنگسار ہو رہا ہے خُدا، سخت کافرم

باہر مَیں جب صلیب سے جا کر گلے مِلا
اندر سے ایک شور اُٹھا سخت کافرم

کوہِ ندا کے سامنے کس کو مجال تھی
سب چُپ رہے تو مَیں نے کہا سخت کافرم

مَیں نے کہا کہ ''نرم دلی'' کُچھ دکھایئے
مُفتی نے سُن کے فتویٰ دیا سخت کافرم

لوگوں نے بے دریغ لُغت ساری لُوٹ لی
جو بچ گیا تھا اُس سے بنا سخت کافرم

آخر مجھے بچانا بھی تھی رسمِ اولیا
سو مَیں نے خود پہ پھونک لیا سخت کافرم

مٹتی نہیں لکیر یہ میری کھنچی ہُوئی
پتھر پہ لکھ چُکا ہُوں رضاؔ سخت کافرم

کبھی آتش، کبھی مٹی، کبھی پانی سے نکل
بے نشاں بھی کوئی آتا ہے نشانی سے نکل

وُہی مٹی، ہے وُہی چاک، وہی تُو، وُہی مَیں
جانے کیا جاتا ہے پھر میری روانی سے نکل

تُو نے کیوں وقت سے پہلے یہاں ڈیرہ ڈالا
اے تھکن چھوڑ مجھے، میری جوانی سے نکل

گھیر لیتا ہے کسی رُوحِ مُعطر کی طرح
مَیں نے جانا ہے مگر عالمِ فانی سے نکل

اے مرے عشق بنا ایک ٹھکانہ کوئی
اب نکلنا ہے تو اس نقل مکانی سے نکل

پناہ مانگیے خُود ساختہ ''بزرگوں'' سے
کبھی حساب تو لے گا خُدا ''بزرگوں'' سے

کُچھ ایسی جنگ ہُوئی نوجواں ''فرشتوں'' میں
گلہ نہیں کوئی باقی رہا ''بزرگوں'' سے

جو چاہیے وُہ بصارت نہیں بصیرت تھی
پڑھا گیا نہ ہمارا لکھا ''بزرگوں'' سے

اگرچہ عشق کی گردان کرنے والے تھے
کبھی نہ کلمہءِ حیرت سُنا ''بزرگوں'' سے

نظر کو دُور سے آ کر ملی وُہ ریشِ دراز
مگر وُہ نُورِ خُدا کب ملا ''بزرگوں'' سے

مَیں ٹمٹماتا رہا اُن کی بُجھتی آنکھوں میں
بُجھایا جا نہ سکا اک دیا ''بزرگوں'' سے

حدیثِ کون و مکاں بھی پڑھا رہے ہیں مجھے
اگرچہ عُمر میں ہُوں مَیں بڑا'' بزرگوں'' سے

وُ ہی ہیں بھیس میں اب صُوفیوں کے پیروں کے
عطا ہُوا جنہیں بُغض و ریا ''بزرگوں'' سے

اُتاری غیب سے جیسے مری غزل کی ردیف
اسی طرح مجھے مالک! بچا ''بزرگوں'' سے

مرا گُمان مرا پہلا دین ہونے لگا
جو دیکھتا گیا اُس کا یقین ہونے لگا

مجھے نکال کے اُس دشتِ بے توجہ سے
ہر ایک شخص مرا جانشین ہونے لگا

وُہ جس کو مَیں نے بُلا کر بٹھایا پہلو میں
مجھے دھکیل کے مسند نشین ہونے لگا

جو سر ہلانے لگا دوستوں کی مرضی سے
اُسے بتایا گیا وُہ ذہین ہونے لگا

یہ کائنات مری آنکھ میں رُکی کیسے
یہ آسمان کہاں بے زمین ہونے لگا

سُخن میں آگ لگاتے رہے مرے نمرود
سو حرف حرف مرا بہترین ہونے لگا

تو یہ بھی نامِ محمدؐ کی اک کرامت ہے
کہ لامکاں مرے دل میں مکین ہونے لگا

اگرچہ وقت مناجات کرنے والا تھا
مگر مَیں اُس سے سوالات کرنے والا تھا

مجھے سلیقہ نہ تھا روشنی سے ملنے کا
مَیں ہجر میں گُزر اوقات کرنے والا تھا

مَیں سامنے سے اُٹھا اور لَو لرزنے لگی
چراغ جیسے کوئی بات کرنے والا تھا

کُھلی ہُوئی تھیں بدن پر رُواں رُواں آنکھیں
نجانے کون مُلاقات کرنے والا تھا

وُہ میرے کعبہءِ دل میں ذرا سی دیر رُکا
یہ حج ادا وُہ مرے ساتھ کرنے والا تھا

کہاں یہ خاک کے تودے تلے دبا ہُوا جسم
کہاں مَیں سیرِ سماوات کرنے والا تھا

آنا جانا ہے تو قامت سے تُم آؤ جاؤ
درِ اظہارِ مروت سے تُم آؤ جاؤ

وُہ تحیّر جو تُمھیں لے کے یہاں آیا تھا
اُس تحیّر کی وساطت سے تُم آؤ جاؤ

ہم کسی سمت بگولوں کو نہیں روکتے ہیں
گرمیٔ ذوقِ شرارت سے تُم آؤ جاؤ

کف اُڑانے پہ بھی پابندی نہیں ہے کوئی
ہاں مگر تھوڑی نفاست سے تُم آؤ جاؤ

ہمیں اُمیدِ بلاغت تو نہیں ہے تُم سے
بس ذرا تھوڑی بلوغت سے تُم آؤ جاؤ

کس نے روکا ہے سرِ راہِ محبت تُم کو
تُمھیں نفرت ہے تو نفرت سے تُم آؤ جاؤ

تُم کہ طفلانِ ادب ساتھ لگائے ہُوئے ہو
کسی منقول شریعت سے تُم آؤ جاؤ

ہم نے اشعار کا دروازہ کُھلا رکھا ہے
جب بھی جی چاہے سہولت سے تُم آؤ جاؤ

وہ تھک نہ جائے کہیں اُس کا ڈر لگا ہُوا ہے
مجھے تھکانے میں جو ہم سفر لگا ہُوا ہے

مجھے ہٹا کے بھلا تُم کہاں سے گُزرو گے
اگر یہاں مرے ہونے سے دَر لگا ہُوا ہے

یہ روشنی کا شجر ہے کوئی چراغ نہیں
یہ لوَ نہیں ہے یہ اس پر ثمر لگا ہُوا ہے

یہ اور بات کہ ڈھنڈورا پیٹتا نہیں مَیں
اگرچہ دھیان مرا بھی اُدھر لگا ہُوا ہے

لہو پروں میں کسی اور کا نہیں پیارے
مری اُڑان میں میرا ہُنر لگا ہُوا ہے

یہ لوگ ایسے مرے شعر کو کُریدتے ہیں
کہ جیسے کوئی تماشائے زَر لگا ہُوا ہے

اک آخری یہی صُورت بچی علاج کی تھی
سو عزرَئیل یہاں چارہ گر لگا ہُوا ہے

جانے یہ صرف مری کور نگاہی کوئی ہے
یا حقیقت میں اُفق پر بھی سیاہی کوئی ہے

یہ کھنڈر یُونہی نہیں چھوڑے گئے ہیں، ان میں
خلق کے واسطے پیغامِ الٰہی کوئی ہے

روز دی جاتی ہے منبر سے جو ترغیبِ فساد
اس سے بڑھ کر بھی زمانے کی تباہی کوئی ہے؟

مَیں نہیں مانتا مذہب یا عقیدے کی دلیل
کیا محبت کے خلاف اور گواہی کوئی ہے

آپ شاعر بھی ہیں نقاد بھی، فرعون بھی آپ
آپ نے بات بھلا میری سراہی کوئی ہے

مَیں نہیں مانتا پانی پہ بنے نقش و نگار
آپ کے ہاتھ میں جو فتویٰ ءِ شاہی کوئی ہے

کیا اسے آپ خُود اپنے لیے کرتے ہیں پسند؟
آپ نے بات مرے حق میں جو چاہی کوئی ہے

رات مَیں شانہءِ ادراک سے لگ کر سویا
بند کی آنکھ تو افلاک سے لگ کر سویا

اُونگھتا تھا کہیں محراب کی سرشاری میں
اک دِیا سا کسی چقماق سے لگ کر سویا

ایک جلتا ہُوا آنسو جو نہیں سوتا تھا
دیر تک دیدہءِ نمناک سے لگ کر سویا

ان گنت آنکھیں مرے جسم پہ چُندھیائی رہیں
بُقعہءِ نُور مری خاک سے لگ کر سویا

کُوزہ گر نے مرے بارے میں یہ دفتر میں لکھا
چاک سے اُترا مگر چاک سے لگ کر سویا

نیند کی شرط تھی تنہا نہیں سونا مُجھ کو
ہجر تھا سو اسی سفّاک سے لگ کر سویا

رات کانٹوں پہ گُزاری تو سویرے سوچا
کس لیے خیمہ ءِ عُشاق سے لگ کر سویا

نیند سُولی پہ چلی آئی سو زخمِ عُریاں
اپنی اِک خواہشِ پوشاک سے لگ کر سویا

ایک دیوار ہے دیوار سے اُونچا ہونا
میرے معیار کا معیار سے اُونچا ہونا

یہ مرا وقت ہے اور یُوں بھی مشیّت ہے میاں
نئے سُورج کا شبِ تار سے اُونچا ہونا

یہ جو دستار ہے یہ طفل تسلی ہے تُمھیں
مُجھ کو خُوش آتا ہے کردار سے اُونچا ہونا

اُسی رفتار سے نیچے بھی مَیں گِر سکتا ہُوں
اتنا آساں نہیں رفتار سے اُونچا ہونا

ورنہ کیوں برق مرے سر کا سہارا لیتی
کام آیا میرا مینار سے اُونچا ہونا

کون اب دے گا گھنی چھاؤں مجھے، کوئی نہیں
خُود ہی چاہا تھا ان اشجار سے اُونچا ہونا

سوچ اے قصرِ مذلّت میں سسکتے ہُوئے شخص
تُو نے چاہا نہیں ایثار سے اُونچا ہونا

تیری مٹی میری مٹی یہ ہماری مٹی
ایک بے کار کا بیکار سے اُونچا ہونا

زمیں کا بوجھ اور اُس پر یہ آسمان کا بوجھ
اُتار پھینک دُوں کاندھوں سے دو جہان کا بوجھ

پڑا ہُوا ہُوں مَیں سجدے میں کہہ نہیں پاتا
وُہ بات جس سے کہ ہلکا ہو کُچھ زُبان کا بوجھ

پھر اس کے بعد اُٹھاؤں گا اپنے آپ کو مَیں
اُٹھا رہا ہُوں ابھی اپنے خاندان کا بوجھ

دبی تھی آنکھ کبھی جس مکانِ حیرت سے
اب اُس مکاں سے زیادہ ہے لامکان کا بوجھ

اگر دماغ ستارہ ہے، ٹوٹ جائے گا
چمک چمک کے اُٹھاتا ہے آسمان کا بوجھ

تو جُھریوں نے لکھا اور کیا اُٹھاؤ گے؟
اُٹھایا جاتا نہیں تُم سے جسم و جان کا بوجھ

پلٹ کے آئی جو غفلت کے اُس کُرے سے نگہ
تو سلوٹوں میں پڑا تھا مری تھکان کا بوجھ

جو عُمر بیت گئی اُس کو بُھول جاؤں رضاؔ
پرِ خیال سے جھٹکوں گئی اُڑان کا بوجھ

غیب کا ہاتھ مرے ہاتھ میں آ سکتا ہے
کُوزہ گر چاک سے اب مُجھ کو اُٹھا سکتا ہے

تُو نے سوچا نہیں طائف سے گُزرتے ہُوئے شخص
کوئی پتھر تُجھے ادراک میں لا سکتا ہے

وقت سے آگے نکلتے ہوئے سوچا بھی نہ تھا
وُہ مرے ساتھ یہ دیوار چلا سکتا ہے

کیا مَیں امداد کو آیا ہُوا آنسو روکوں
کیا فرشتہ یہ مری آنکھ سے جا سکتا ہے

حیرتی ہُوں سو مری کون ضمانت دے گا
کوئی منظر ہو، مجھے وجد میں لا سکتا ہے

پھڑ پھڑاتے ہُوئے شُعلے سے بندھی جان بھی ہے
اس پرندے کو دیا کیسے اُڑا سکتا ہے

پھول کے جسم کو دیکھوں کہ مہک کو سمجھوں
یہ تعلق تو کسی سمت بھی جا سکتا ہے

اب مرے لوگ مرے مدِ مقابل ہیں رضؔا
اب یہ آسیب مرے مُلک کو کھا سکتا ہے

تلخی ذرا بیان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب
یہ تیر اِس کمان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

کرتا ہُوں پہلے غیر مسلح عدو کو مَیں
شمشیر پھر میان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

مُجھ میں کوئی بگولہ مُسلسل سفر میں ہے
تیزی سی جو اُٹھان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

یُونہی چُھپا رہا تھا محبت کی واردات
لُکنت کہاں زُبان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

گاہک یہاں زیادہ پُرانے سُخن کے ہیں
اشیا نئی، دُکان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

بُنیاد لامکان میں رکھّی تو کیا ہُوا
دیوار و در جہان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

تھامے ہُوئے ہُوں لَو کو جو تھاما ہُوا ہے سَر
اپنا دماغ دھیان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

کردار دوستوں کا کرے گا یہ فیصلہ
کس کس کو داستان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

کتنی مُنافقت ہے کہ رَہ کر زمین پر
دل اپنا آسمان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

زخمی پروں سے اُڑنے کا دُگنا ثواب ہے
پیشِ نظر اُڑان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

یہ جو سُنا رہا ہُوں غزل آپ کو رضاؔ
دُکھ اپنے خاندان میں رکھتا ہُوں مَیں جناب

یہاں پہ سلسلہ در سلسلہ سمندر ہے
وُہ لامکان سے آگے مرا سمندر ہے

یہ آنکھ راستہ دیتی تو دیکھتی دُنیا
اُچھل رہا ہے جو دل پر وُہ کیا سمندر ہے

اگر مَیں موج میں آیا تو خُود کو کھو دُوں گا
مرے قریب کسی اور کا سمندر ہے

مَیں پیاس آنکھ میں بھرنے لگا تو مُجھ پہ کُھلا
کہ دُور دُور تلک ریتلا سمندر ہے

سمندروں کی گواہی خُدا نہیں دیتا
خُدا گواہ نہیں ہے خُدا سمندر ہے

ضرور پھر کوئی فرعون ہے تعاقب میں
جو رُک کے راستہ دیتا ہُوا سمندر ہے

یہاں پہ نام بدلتے ہیں سب حسین و یزید
جو بہہ رہا ہے وُہی کربلا سمندر ہے

مری غزل کے جزیرے پہ سانس لے لومیاں
کہ اس کے بعد بڑا بے رُخا سمندر ہے

پُھونکا تھا پڑھ کے اسم ترا، دَم نہیں ہُوا
شُعلہ خُدا کے نام پہ مدّھم نہیں ہُوا

کم ظرف تو نہیں ہُوں کہ محراب پُھونک دُوں
ویسے مجھے ملال کوئی کم نہیں ہُوا

میرا یقین کیا ہے خطِ مُستقیم ہے
اک بار چل پڑا تو کہیں خَم نہیں ہُوا

جِنّوں نے یہ لیا تو فرشتوں نے دُوسرا
میرے لیے تو کوئی بھی عالَم نہیں ہُوا

مُرشد نے ہاتھ اُٹھا لیا سازِ جہان سے
اس واسطے سلیقۂ سرگم نہیں ہُوا

اُس سمت سے ستارہ اُڑا اِس طرف سے مَیں
وُہ جل بُجھا، مَیں گِر گیا، سنگم نہیں ہُوا

اے آئینے میں حرفِ شکایت کو سُنتے شخص
تُو پہلا آدمی ہے جو برہَم نہیں ہُوا

پانی جو موج اُترتے ہی پتھر سے ہٹ گیا
دل میرا بُجھ گیا مَیں سمندر سے ہٹ گیا

اکثر یہی ہُوا ہے کہ دِل چیرتا ہُوا
حیراں نہ کر سکا تو مَیں منظر سے ہٹ گیا

رونے سے میرے ، ایک فرشتہ تھا مُضطرب
مَیں توڑ کر نماز برابر سے ہٹ گیا

وُہ بھی ''بڑا'' امیر تھا مَیں بھی ''بڑا'' غریب
کُچھ بخشنے لگا تو مَیں اُس در سے ہٹ گیا

ٹُوٹے ہُوئے ستارے سے عبرت پکڑ میاں
انجامِ کار تُو بھی جو محور سے ہٹ گیا

آنکھ کی امداد کو آنسو جو آیا ، جل گیا
مَیں تو شیطاں کو جلاتا تھا فرشتہ جل گیا

نقشِ پا سے آگ پکڑی اور رستہ جل گیا
یہ سفر دو آتشہ تھا مُجھ سے صحرا جل گیا

اُڑ گئی آنکھوں سے حیرت ساتھ میرا رنگ اُڑا
پھڑپھڑاتا تھا دیے پر جو پرندہ، جل گیا

آتشِ سیال بھاگی جسم سے سر کی طرف
سر مصلّے پر جو ٹیکا، میرا ماتھا جل گیا

واعظِ بےعقل بھی میرے سُخن میں آ گھسا
مَیں بچاتا رہ گیا وُہ اچھّا خاصا جل گیا

پیش رو میرا تھا اُس کی پیروی اب فرض ہے
اپنے محور سے نکل کر جو ستارہ جل گیا

اب تو سُورج کی طرح دل کی نہیں کوئی خبر
جانے کتنا رہ گیا ہے اور کتنا جل گیا

حضرتِ غالبؔ کو سمجھانے چلا ہُوں مَیں رضاؔ
جو زمیں سے کٹ گیا وُہ شعر سُوکھا جل گیا

جو بے صدا یہ مرا ساز کر رہے ہو میاں
تو سَر تا پا مجھے آواز کر رہے ہو میاں

یہ جو مجھے نظر انداز کر رہے ہو میاں
یہ میرے حق میں اک اعزاز کر رہے ہو میاں

بٹھا رہے ہو جو تنہائی کے کٹہرے میں
تو اور بھی مجھے ممتاز کر رہے ہو میاں

دِکھا رہے ہو مجھے آسمان کا رستہ
مری اُڑان کا آغاز کر رہے ہو میاں

نکل کے ڈُوبنے والا تھا کیا کِیا تُم نے
اب افشا کیوں یہ مرا راز کر رہے ہو میاں

تمہارے سینوں میں ہر سچ کی بازگشت ہُوں مَیں
جو بولنے سے مجھے باز کر رہے ہو میاں

یہ برق ہے جو رضاؔ کوندتی ہے سطروں میں
یہ آگ ہے جسے الفاظ کر رہے ہو میاں

حرف میرے رہِ پامال سے ناپاک نہیں
ان زمینوں پہ کسی اور کے افلاک نہیں

صورتِ حال بدلتی ہی نہیں ہے یا پھر
صورتِ حال کا مُجھ کو کوئی ادراک نہیں

اس لیے مُجھ کو نکالا گیا درویشی سے
مَیں نے گدڑی تلے پہنی ہُوئی پوشاک نہیں

ایک مٹی ہے جو بے وجہ پڑی ہے یُونہی
ایک تودہ ہے مرا جسم جو نمناک نہیں

صف بہ صف آنکھ کے کشکول اُٹھائے ہُوئے لوگ
یہ نمازی تو بھکاری ہیں، یہ عُشاق نہیں

تُو بکھیرے چلا جاتا ہے کہیں ٹھیر کے دیکھ
یہ ستارے ہیں خُدایا یہ مری خاک نہیں

عشق جب چاہے اُسے ساتھ لگا لے جائے
حُسن، چالاک سہی اتنا بھی چالاک نہیں

دَم نکلتا ہے اِسی موڑ پہ دَم لینے سے
کون کہتا ہے بھلا ہجر خطرناک نہیں

مَیں ناقصانِ رہِ کاملاں میں آخری ہُوں
گھسٹ رہا ہُوں کہ اِس کارواں میں آخری ہُوں

یہ میری خاک اُڑی ھی نہیں تدبر سے
پتہ بھی تھا اِسے مَیں رائیگاں میں آخری ہُوں

کسی کا ہاتھ نہ آئے اگر سہارے کو
تو یہ کُھلے کہ صفِ ناتواں میں آخری ہُوں

حریصِ کشف سہی میرا حوصلہ تو دیکھ
کہ اِس اُمید گہِ سائلاں میں آخری ہُوں

یہ تیغِ خاص ابھی بے نیام کیوں کر لی
سنبھال اِسے مَیں صفِ دوستاں میں آخری ہُوں

یہ بُجھ رہا ہُوں کہ روشن ہُوا ہُوں جان تلک
مَیں جلتی بُجھتی ہُوئی کہکشاں میں آخری ہُوں

غزل صحیفہ ہے میرا مَیں خاتَمُ العُشاق
مَیں پہلے آ کے، صفِ عاشقاں میں آخری ہُوں

یہ شش جہت کوئی جلتا نشان مانگتے ہیں
مجھے اُچھال مَیں آتش فشاں میں آخری ہُوں

کہاں ہیں نقشِ قدم اُس کے ، کون پہلا تھا
رضاؔ اگر مَیں یہاں لامکاں میں آخری ہُوں

کوئی بتائے بِنا میرے گھر نہیں آتا
مگر یہ ہجر کبھی پُوچھ کر نہیں آتا

دکھائی دیں گے در و بام کس طرح میرے
اُداس رنگ کسی کو نظر نہیں آتا

اُڑان بھرتے ہی پھر سے بکھر گئی مٹی
پروں کی چاہ سے اس میں اثر نہیں آتا

تو کیا یہ مسند و منبر کی بدنصیبی ہے
کہ اُن پہ شخص کوئی مُعتبر نہیں آتا

اُتر کے دیکھتا ہُوں بے پناہ گہرائی
رہوں گا موج میں جب تک اُبھر نہیں آتا

ضرور مَیں ابھی کچا ہُوں اپنی وحشت میں
جسے عزیز بیاباں ہو، گھر نہیں آتا

دُکانِ وعظ یہاں سے بڑھایئے صاحب
مَیں بے ہُنر ہُوں مجھے یہ ہُنر نہیں آتا

یہ آزمائشِ پیہم نہیں عذاب ہے یہ
ہماری قوم میں جو راہبر نہیں آتا

بکھیرنے سے مری خاک دیدنی ہُوئی ہے
خُدا کا شُکر کسی طرح روشنی ہُوئی ہے

اسے گلے سے لگا لُوں کہ انتظار کروں؟
یہ خُوش گُمانی جو اتنی بنی ٹھنی ہُوئی ہے

مَیں زرد رُو تو ترے شہر سے چلا آیا
یہ کس کی شام مرے بعد کُندنی ہُوئی ہے

لکیر میری ہتھیلی پہ زندگی کی کہاں
یہ راستے میں کوئی روک سی بنی ہُوئی ہے

لپٹ گئی ہے امَر بیل سبز خواہش سے
یہ دوستی ہُوئی ہے یا کہ دُشمنی ہُوئی ہے

مجھے بُجھانے پہ کوئی کہیں تو شور کرے
یہ لَو چُرائی گئی ہے، یہ رہزنی ہُوئی ہے

یہ وارداتِ محبت وُہی ہے اور رضاؔ
یہی کہانی کسی اور سے سُنی ہُوئی ہے

چراغ بھیڑ میں لے جا کے مارنا پڑے گا
یہ لَو نہیں میرا سر بھی اُتارنا پڑے گا

صلیب پر بھی نکلنی نہیں ہے جان مری
مجھے وہاں بھی خُدا کو پُکارنا پڑے گا

ڈبو نہ مُجھ کو سمندر تُو رازداری سے
مجھے ڈبونے سے پہلے اُبھارنا پڑے گا

جو شک کا ذائقہ آیا ہے آبِ حیرت میں
تو کیا یقین کا زمزم نتھارنا پڑے گا

یہاں پہ اب مری آنکھیں ہی کام آنی ہیں
یہ سیلِ وقت یہیں سے گُزارنا پڑے گا

سُن اے سِدھارتھ تجھے روشنی بُلاتی ہے
سو شہر چھوڑ کے بَن کو سِدھارنا پڑے گا

یہ آئینہ ہے کہ ٹُوٹا ہُوا مرا چہرہ
یہ جوڑنا پڑے گا یا سنوارنا پڑے گا

فقیر تو یہاں عزت سے رہ رہے ہیں رضاؔ
مجھے اب اور کوئی رُوپ دھارنا پڑے گا

پہلے تو قتل کا سامان کیا جانے لگا
پھر مرے سوگ کا اعلان کیا جانے لگا

کوئی بے داغ نہیں دشت میں کیا میری طرح
مَیں اکیلا جو یہ قُربان کیا جانے لگا

پھڑپھڑانے لگی لَو زرد پرندے کی طرح
جب چراغ اتنا پریشان کیا جانے لگا

وُہ جو لایا تھا سیَہ رات کے جانے کی خبر
اُس ستارے کا بھی نُقصان کیا جانے لگا

مجھے تسبیح تھمائی گئی منظر کے قریب
میری حیرت کو مُسلمان کیا جانے لگا

درِ توفیق سے اُٹھتے ہُوئے آنسو نکلے
کام میرا کوئی آسان کیا جانے لگا

خاک نے سیرِ سمٰوات میں آنکھیں کھولیں
دِیا محراب میں حیران کیا جانے لگا

کیا کروں میرے طرف دار نہیں مانتے ہیں
غلطی میری مرے یار نہیں مانتے ہیں

مری آنکھوں میں یہ آنسو ہیں دِکھاوے کے لیے
لوگ کیوں مُجھ کو اداکار نہیں مانتے ہیں

خُود سے لڑ کر بڑا نقصان کیا ہے لیکن
سب مجھے بر سرِ پیکار نہیں مانتے ہیں

لوگ کرتے تو وہی کُچھ ہیں جو مَیں کرتا ہُوں
پر مجھے صاحبِ کردار نہیں مانتے ہیں

اب ترے شہر کے کُچھ لوگ بھی ہیں تیرے خلاف
ہجر میں مُجھ کو گُنہ گار نہیں مانتے ہیں

ہاتھ آئی نہیں اپنے کوئی جاگیر تو اب
ہم کسی شخص کو حقدار نہیں مانتے ہیں

اور کُچھ بھی نہیں ہنگامہ و شورش کا سبب
لوگ سرکار کو سرکار نہیں مانتے ہیں

دیجئے ہم کو اجازت کہ گُزرنا ہے ہمیں
ہم تو دیوار کو دیوار نہیں مانتے ہیں

ظفؔر اقبال ہو، غالبؔ ہو کہ ہو میرؔ، رضاؔ
ہم کسی شخص کو معیار نہیں مانتے ہیں!

رنگ و خُوشبو کو خریدار کہاں دیکھتے ہیں؟
لوگ بُھوکے ہوں تو معیار کہاں دیکھتے ہیں؟

ہم نے مُڑ مُڑ کے اسی خاکِ وطن کو دیکھا
ورنہ جاتے ہُوئے غدار کہاں دیکھتے ہیں؟

ٹھیرِیے خلق کو درگاہ پہ مَیں دیکھتا ہُوں
آپ سردار ہیں سردار کہاں دیکھتے ہیں؟

باندھ رکھی ہے کلائی پہ گھڑی تو یُونہی
وقت کو ایسے، سمجھدار کہاں دیکھتے ہیں؟

سَر اگر پھوڑنا لازم ہو تو پھر اہلِ جُنوں
ہاتھ سے سختیءِ دیوار کہاں دیکھتے ہیں؟

دیکھ سکتے نہیں اطراف میں پھیلا ہُوا خُون
ہم ستاروں کے پھر اُس پار کہاں دیکھتے ہیں؟

ساری حیرت تو مری آنکھ اُٹھا لے آئی
میرے دیکھے ہُوئے کو، یار کہاں دیکھتے ہیں؟

آنکھ میں خُون ہے اس کور نگاہی کا سبب
حادثے مُجھ کو لگاتار کہاں دیکھتے ہیں؟

یہ تو ڈھلکے ہُوئے اشکوں نے ہمیں روک لیا
ہم تری سُرخیِ رُخسار کہاں دیکھتے ہیں؟

مَیں سوچتا ہی نہیں مُجھ سے کیا لکھا گیا ہے
جو کُچھ لکھا گیا بے ساختہ لکھا گیا ہے

بہت سے لوگ ''محبت'' سے پڑھ رہے ہیں مجھے
مرا لکھا ہُوا پھر، بار ہا لکھا گیا ہے!!

یہی حروف تھے پہلے بھی سانحہ بھی وُہی
لہو مِلانے سے اب خُوش نُما لکھا گیا ہے

مجھے زمین سے منسوب ہی نہیں ہونا
اسی لیے تو مجھے لاَپتہ لکھا گیا ہے

سیاہ نامے چَھپے ہیں کئی فقیروں کے
کہیں چراغ، کسی کو دِیا لکھا گیا ہے

رُکا ہُوا تھا تو دیوار اُس پہ لکھا تھا
گُزر گیا ہُوں تو اب راستہ لکھا گیا ہے

کہیں پہ ملبہ گِرا بھی نظر نہیں آتا
مکان اپنی جگہ بھی نظر نہیں آتا

گُزرتا رہتا ہُوں دیوارِ بے یقینی سے
کہیں پہ رستہ بنا بھی نظر نہیں آتا

کوئی مہک سی مرے گرد و پیش پھیلی ہے
فنا کا پھول کِھلا بھی نظر نہیں آتا

منڈیر آنکھ سے اوجھل ہے کس طرف کو گِروں
مجھے تو پاؤں ٹِکا بھی نظر نہیں آتا

نہیں کیا گیا شُعلے کی موت پر نوحہ
چراغ ٹُوٹا ہُوا بھی نظر نہیں آتا

جدائی جلد سے ناخن اُکھیڑ لیتی ہے
مگر یہ زخم کُھلا بھی نظر نہیں آتا

وُہ آ گیا ہے زیادہ قریب آنکھوں کے
اسی لیے تو ذرا بھی نظر نہیں آتا

کُچھ آنکھیں تاب بھی لاتی نہیں نظارے کی
رُواں رُواں یہ نشہ بھی نظر نہیں آتا

خزاں کی آنکھ سے دیکھا ہے مَیں نے عالم کو
اسی لیے یہ ہرا بھی نظر نہیں آتا

اُسے بھی پڑ گئی عادت فریب کھانے کی
مَیں دیکھنے میں بُرا بھی نظر نہیں آتا

وِفا یہی ہے کہ تُم سے وفا کریں ہم لوگ
تُمھیں پسند نہیں ہے تو کیا کریں ہم لوگ

ہمیں تو دین سے تُم نے نکال ڈالا ہے
تمہارے حق میں بھلا کیا دُعا کریں ہم لوگ

تو آسمان بھلا سَر پہ کیسے رہنا ہے
اگر سلوک زمیں سے بُرا کریں ہم لوگ

چَلا اِسے تری مرضی ہے جس طرح چاہے
ترے سپرد، ترا سلسلہ کریں ہم لوگ

یہ کائنات کہیں تھم گئی تو سوچیں گے
کہاں کہاں پہ ترا حج ادا کریں ہم لوگ

خُدا پہ چھوڑ دیا ہے تو ٹھیک ہے صاحب
خُدا کرے کہ کسی کا بھلا کریں ہم لوگ

پل پل تھرک رہا ہے یہ پارہ دماغ کا
ہوتا نہیں ہے سَر میں، گُزارا دماغ کا

چنگاریاں رگوں میں رواں ہیں لہو کے ساتھ
پھٹنے لگا ہے جیسے شرارا دماغ کا

باہر نکل نہ جائے زمان و مکان سے
روکا ہُوا ہے آج تو دھارا دماغ کا

جا اپنے آسمان کو خُود ہی اُٹھا کے پھر
مَیں تو ہٹا رہا ہُوں سہارا دماغ کا

لازم تھا احترام صحیفے کے واسطے
رکھا ہُوا ہے سر پہ سپارا دماغ کا

کس کو یہاں تلاش مرے لامکاں کی ہے
چھوڑے گا کیوں لکیر، ستارہ دماغ کا

ہر آئینے کے سامنے رکھا ہے آئینہ
اب کیا کرے دماغ، نظارہ دماغ کا

احباب کو سُناتا نہیں اس لیے کلام
گُونجے گا کیا خلاؤں میں نعرہ دماغ کا

سارا جہاں جب آئینہ خانے میں لگ گیا
پھر وُہ مجھے یہ نظم سُنانے میں لگ گیا

کہنے لگا کہ آٹھواں سُر راگ میں لگا
مَیں نے لگایا اور مَیں گانے میں لگ گیا

کہنے لگا کہ لکھ اِسے لکھتے ہیں خُون سے
مَیں نے لکھا تو عُمر بِتانے میں لگ گیا

کہنے لگا یہی تری پرواز ہے میاں
مَیں نے سُنا تو خاک اُڑانے میں لگ گیا

کہنے لگا کہ کھیل مجھے ڈھونڈنے کا کھیل
پھر مَیں بھی اُس کا کھوج لگانے میں لگ گیا

کہنے لگا چراغ مرے نام کا جلا
مَیں اپنے جسم و جان جلانے میں لگ گیا

بھٹکا مرا خیال خُدا کی طرف اگر
سارا زمانہ، راہ پہ لانے میں لگ گیا

مَیں نے دُعا کے ساتھ سوالات رکھ دیے
پھر وہ بھی مُجھ سے پیچھا چُھڑانے میں لگ گیا

آخر خُدا مِلا بھی تو خوفِ خُدا کے ساتھ
یعنی مَیں اُس سے خُود کو ڈرانے میں لگ گیا

شُعلے کا سَر جُھکایا نہیں جا سکا رضؔا
تنگ آ گیا تو خُود کو بُجھانے میں لگ گیا

بُجھے ہُوئے جو ندامت سے دیکھتے ہیں مجھے
یہ لوگ کیا کسی جنت سے دیکھتے ہیں مجھے

یہ کاروبارِ رقابت نیا نہیں صاحب
کئی چراغ بھی نفرت سے دیکھتے ہیں مجھے

برہنہ زخم تماشہ بنا لیا گیا ہے
پتہ چلا ہے تو شدت سے دیکھتے ہیں مجھے

مُیسر اس کو ابھی لمسِ کُوزہ گر کیوں ہے
جو بن چُکے ہیں وُہ حسرت سے دیکھتے ہیں مجھے

جنہیں نصیب ہُوئی ہے نگاہِ خُشک میاں
وُہ چشمِ نم کی ضرورت سے دیکھتے ہیں مجھے

مَیں دیکھا جاتا نہیں دوستی کے ناتے سے
جو دیکھتے ہیں مروت سے دیکھتے ہیں مجھے

نہیں ہے کام کسی اور سے انہیں شاید
یہ حادثے بڑی فُرصت سے دیکھتے ہیں مجھے

کھڑا ہُوا کسی محراب میں مَیں جلتا ہُوں
تو شُعلے پُوری سہولت سے دیکھتے ہیں مجھے

جو منظروں کو ہُوا ہے کبھی مجھے ہُوا تھا
مَیں دیکھتا ہُوں تو حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے

ادب کہاں ہے یہ بالشتیوں کی بستی ہے
یہاں تو سب قد و قامت سے دیکھتے ہیں مجھے

خلا کے پاس یہی راستہ نکلتا ہے
وُہ اس پہ چل کے مرے دل میں آ نکلتا ہے

نکلنے دیتا نہیں ہُوں مَیں آنکھ سے آنسو
جو یہ نکلتا ہے دل سے خُدا نکلتا ہے

زمین رنج سے روتی ہے نسلِ آدم پر
کہ جیسے کُوکھ سے بچہ مَرا نکلتا ہے

یہ چلتے پھرتے ہوئے زخم ہیں کہ آدمی ہیں
جسے ٹٹول کے دیکھو، دُکھا نکلتا ہے

یہ کم نہیں مری خوش قسمتی کہ قُرعے میں
بطورِ خاص کوئی حادثہ نکلتا ہے

مَیں امتحان سے ڈرتا ہُوں جی چُراتا ہُوں
تو پھر نتیجہ بھی اُس کا بُرا نکلتا ہے

بڑی چمک ہے یہاں ناقدوں کے ہاتھوں میں
کہ جس میں کھوٹ ہو بس وہ کھرا نکلتا ہے

لہو یہ کیوں مجھے حیرت سے دیکھتا ہے رضاؔ
بدن گھسیٹ کے پتھر پہ، کیا نکلتا ہے!!

ہوا چلی ہے وہی پَر اُچھالنے کے لیے
گِرا دیئے جو نئے پَر نکالنے کے لیے

مرے لیے کوئی منظر دوائے حیرت ہے
دُکھی ہُوئی مری آنکھوں میں ڈالنے کے لیے

میں لڑکھڑایا تو فوراً بہت سے لوگ بڑھے
مجھے گِرانے کی خاطر سنبھالنے کے لیے

عجب تو یہ ہے کہ کوشش ہمیشہ کرتی ہے
یہ زندگی ہی مجھے مار ڈالنے کے لیے

عطا ہُوئی کسی عفریت کی طرح یہ زمیں
بدن کی تازہ خراشوں پہ پالنے کے لیے

اگر لگا کہ یہاں پر بہت اندھیرا ہے
تو آنکھ بند کروں گا اُجالنے کے لیے

خواہش یہی ہے آخری، تسکین کے لیے
افلاک کھودنا مری تدفین کے لیے!

لکھنا یہ میری قبر پہ اک شخص تھا کوئی
بے رنگ ہو گیا کسی رنگین کے لیے

کُچھ لفظ کیا دُعا میں مرے واسطے بھی تھے
سب گُونگے بن گئے ہیں جو آمین کے لیے

پڑھنا تُم احتیاط سے ایسا نہ سب کہیں
بوسے لبوں نے سُورہءِ یاسین کے لیے

پتھرا گئی ہے آنکھ تو نقاد آئے ہیں
معمول کی یہ دیر ہے تحسین کے لیے

نازل ہُوا ہے آنکھ پہ منظر کے سامنے
حیرت نیا فرشتہ ہے اس دین کے لیے

یارانِ خُوش خیال! عنایت ہے آپ کی
مسند پہ لا بٹھایا ہے توہین کے لیے

غالیچہءِ سُخن مجھے لے تو اُڑے مگر
جادو کا ہاتھ چاہیے قالین کے لیے

کُچھ بھی نہیں وجود یہ کُچھ بھی نہیں رضؔا
کافی ہے اُڑتی خاک ہی تلقین کے لیے

نابینوں کو کُچھ نابینے لوگ
بیچنے آئے ہیں آئینے لوگ

میت کا بھی مال چُراتے جائیں
ماس سے ہڈیوں تلک کمینے لوگ

سروں کو پیٹیں ٹُوٹا جن پر ظُلم
کاہے پیٹ رہے ہیں سینے لوگ

دیکھیں اپنی لاشوں کی ترتیب
کسی طرح تو سیکھیں قرینے لوگ

اب پاتال تلک ہی نہ لے جائیں
یہ جو کھود رہے ہیں زینے لوگ

لمحوں منٹوں گھنٹوں بھاگم بھاگ
سال کے پُورے بارہ مہینے لوگ

ساتھ چلے گا اُن کے مَن کا کھوٹ
مکے جائیں یا کہ مدینے لوگ

سنگریزوں میں گُھٹنے لگا ہے سانس
ڈُھونڈ رضاؔ اب اور نگینے لوگ

تنہا مَیں سوچتا ہُوں کہ تنہا مَیں کیا کروں
لوگوں کے جمگھٹوں میں اکیلا مَیں کیا کروں

اوروں کے مشوروں میں مری عُمر کٹ گئی
مَیں نے تو ساری عُمر نہ سوچا مَیں کیا کروں

کیوں کر رہا ہے پھر وُہ ستارے اِدھر اُدھر
مَیں نے کب آسمان سے پُوچھا، مَیں کیا کروں؟

ہجرت نے جیسے بانٹ دیا ہے مرا وجود
آدھا اُدھر پڑا ہُوں یہ آدھا مَیں کیا کروں

اس شہر کے مکیں ہیں بلا کے تماشبین
مَیں سادہ آدمی ہُوں ، تماشا مَیں کیا کروں

میرے تو سارے لفظ ہُوئے ہیں لہولہان
اب اس سے بڑھ کے اور دھماکہ مَیں کیا کروں

سَر رکھ کے رونے کی بھی تو جَا کوئی چاہیے
میت کو دے رہے ہو جو کاندھا مَیں کیا کروں

یہ جو زمیں کا قتل ہے یہ میرا قتل ہے
مَیں مَر رہا ہُوں آپ تو نوحہ مَیں کیا کروں

مٹّی کا نام اور پتہ جانتا ہُوں مَیں
یہ اپنے خاندان کا شجرہ، مَیں کیا کروں

اب گُزارہ کریں مِل جُل کے گھرانے والے
موت بازار سے لائے ہیں کمانے والے

سوچتے کیوں نہیں یہ جسم اُڑانے والے
کُچھ پرندے نہیں ہوتے کہیں جانے والے

خُود بھی بارود کے سامان پہ بیٹھے ہُوئے ہیں
اپنے ہمسایوں کے گھر بار جلانے والے

پائیں فُرصت تو کوئی اور ہُنر بھی سیکھیں
یہ ہُنر مند، جنازوں کو اُٹھانے والے

اک سُرنگ آنکھ میں لگتی ہُوئی پکڑی بر وقت
سارے قیدی تھے مری آنکھ سے جانے والے

بیٹھنا تھا جنہیں دیوار پکڑ کر وہی لوگ
بن گئے شہر کی بُنیاد ہلانے والے

وہی مِنبر، وُہی الفاظ وہی فتویٰء کُفر
وُہی داڑھی ، وہی جُبے ہیں پُرانے والے

یہ جو کہتے ہیں ہوا دوست بنی ہے اُن کی
یہ بھی لگتے ہیں چراغوں کو بُجھانے والے

مرا بدن مجھے اک قید خانہ لگتا ہے
یہاں خبر نہیں کتنا زمانہ لگتا ہے

مَیں اپنے آپ کو رکھتا ہُوں جب نشانے پر
مرے نشانے پہ سب کا نشانہ لگتا ہے

یہ کیا کِیا مجھے اُڑنا سکھا دیا تُو نے
اب آسمان بھی مُجھ کو پُرانا لگتا ہے

نگاہ ڈھونڈ ہی لاتی ہے سانحہ کوئی
مجھے تو روز کوئی تازیانہ لگتا ہے

وُہ آمرانہ نظامِ ادب کے حامی ہیں
مرا رویہ جنہیں باغیانہ لگتا ہے

تمہارے حق میں کوئی فیصلہ ہُوا ہوگا
جو یہ نظام تُمھیں مُنصفانہ لگتا ہے

وُہ ذمے دار ہیں اس جَہلِ دین و دُنیا کے
وُہ جن کا حُلیہ بہت عالمانہ لگتا ہے

مَیں اعتبار تو کر لُوں مگر مرے دُشمن
ترا رویہ بہت دوستانہ لگتا ہے

مَیں دائیں بازو کا حامی نہیں رضاؔ لیکن
خموش رہنا مجھے مُجرمانہ لگتا ہے

اک مُنفرد کُلاہ سے پہچانا جاؤں گا
دستارِ خاکِ راہ سے پہچانا جاؤں گا

لگتا ہے اب وہ وقت بہت ہی قریب ہے
جب مَیں لباسِ کاہ سے پہچانا جاؤں گا

بدخواہ تب تلک مجھے اپنا سمجھ نہ لیں
جب تک مَیں خیر خواہ سے پہچانا جاؤں گا

سچ بولنا ضرور ہے لیکن مَیں کیا کروں
بولوں گا تو کراہ سے پہچانا جاؤں گا

میرا مقدمہ تو خُود اپنے خلاف ہے
مَیں کیا کسی گواہ سے پہچانا جاؤں گا

سُوئے فلک بگولہ اگر لے چلے مجھے
مَیں اپنے ایلیاہ سے پہچانا جاؤں گا

مَیں بھی گِرا ہُوا ہُوں مجھے بھی نکال لے
ورنہ مَیں چاہِ ''چاہ'' سے پہچانا جاؤں گا

اب تک نہیں ہُوا تو مُکمل نہ کر مجھے
اس نقشِ خوامخواہ سے پہچانا جاؤں گا

جس قدر چاہا اُس قدر روئے
عُمر ہنسنے کی تھی مگر روئے

سب کا رونا یہاں برابر ہے
بے ہُنر روئے ، با ہُنر روئے

ہے خُدا جب کہ ہر جگہ موجود
چُھپ چُھپا کر کوئی کدھر روئے

جہاں رونا تھا رو سکے نہ وہاں
اس لیے ہم اِدھر اُدھر روئے

لوگ روئے بچھڑنے والوں پر
اور ہم خُود کو ڈُھونڈ کر روئے

یہاں رونے پہ کیسی پابندی
کیا کوئی تُم سے پُوچھ کر روئے

میرے رونے سے کُچھ نہیں بدلا
اب کوئی اور مُعتبر روئے!

نیند کا پھول مری آنکھ سے جھڑ جاتا ہے
اور پھر صبح تلک پیڑ اُکھڑ جاتا ہے

دیکھنے بعد میں آتے ہیں کھنڈر کو سب لوگ
پہلے اک شہر مرے دل میں اُجڑ جاتا ہے

رات کے ٹوٹے ستارے کا اثر لیتا ہُوں
دن نکلتے ہی کوئی کام بگڑ جاتا ہے

جُھولتا جسم خطرناک ہے اُونچائی پر
کیا کروں ہاتھ ہی اُونچا کہیں پڑ جاتا ہے

آ ہی جاتا ہُوں نظر تیرِ توجہ کو مَیں
کوئی منظر ہو مری آنکھ میں گڑ جاتا ہے

عُمر بھر سیتے چلے جاتے ہیں سینے والے
ایک دن دھاگا تعلق کا، اُدھڑ جاتا ہے

یہ جو ہجرت ہے وطن سے، یہ مُسلسل ہے میاں
ماں سے بچہ کوئی ہر روز بچھڑ جاتا ہے

اسے مَیں فکر کی خوراک ڈال بیٹھا ہُوں
یہ ڈر کا جو سگِ خُوں خوار پال بیٹھا ہُوں

اُڑان فرض ہُوئی اب مجھے اجازت دو
مَیں بازوؤں پہ نئے پَر نکال بیٹھا ہُوں

پلٹ کے پستی میں آتی نہیں ہے بینائی
بُلندیوں میں یہ آنکھیں اُچھال بیٹھا ہُوں

جہان سارا مجھے ڈگمگاتا لگتا ہے
یہ کس جگہ پہ توازن سنبھال بیٹھا ہُوں

مجھے رکوع کا کہہ کر وُہ جب سے بُھول گیا
کھڑا ہُوا ہُوں نہ مَیں اتنے سال بیٹھا ہُوں

خلائے سبز میں گُم ہو گیا مرا ہمزاد
جہانِ زرد میں اب تک نڈھال بیٹھا ہُوں

دُکانِ شعر ہے کوئی کھنڈر نہیں یہ میاں
جدید عہد کا لے کر مَیں مال، بیٹھا ہُوں

یُونہی آوازے کسی لاش پہ کستے ہُوئے لوگ
مرے اندازے سے بڑھ کر یہاں سَستے ہُوئے لوگ

کسی آسیب کے ہونے کا پتہ دیتے ہیں
گہرے سناٹے میں یک دم کہیں ہنستے ہُوئے لوگ

اپنے کاٹے ہُوئے پیڑوں کے تنوں پر بیٹھے
دم بہ دم دُھوپ کی شدت سے جُھلستے ہُوئے لوگ

کبھی غیروں کے مقابل ہوں تو بُجھ جاتے ہیں
آگ کے لہجے میں اپنوں پہ برستے ہُوئے لوگ

آنکھ کے ڈیلے نکالے ہیں کہ دلدل کو بھروں
مُجھ سے دیکھے نہیں جاتے ہیں یہ دھنستے ہُوئے لوگ

مُجھ سے اب رات کو سویا بھی نہیں جائے گا
خُوش ضرورت سے زیادہ ہیں یہ بستے ہُوئے لوگ

ایک ترتیب سے رکھی ہُوئی لاشوں کی قطار
اور پہچانتے چہروں کو ترستے ہُوئے لوگ

اپنی ہی راہ میں دیوار کی صُورت کھڑے تھے
ڈھے گئے جسم تو اپنے لیے رستے ہُوئے لوگ

نہ مِلا زہر کا تریاق کہیں سے بھی مجھے
مَیں نے سانپوں کو دِکھائے مجھے ڈستے ہُوئے لوگ

کہاں کا فائدہ نقصان سے بناتا ہُوں
مَیں جو بناتا ہُوں جی جان سے بناتا ہُوں

حصار ہر گُلِ خوبی کے گِرد میرا ہے
جسے مَیں دیدہءِ حیران سے بناتا ہُوں

یہ میری بے خبری خُود بڑی اذیت ہے
مَیں جہل بھی کسی عرفان سے بناتا ہُوں

اُجڑ رہا ہے جو آباد سے بنایا تھا
بسا ہُوا ہے جو ویران سے بناتا ہُوں

یہ سرگرانی بھی آفات نے عطا کی ہے
بگُولہ اپنا، مَیں طُوفان سے بناتا ہُوں

دل و دماغ و نظر یرغمال ہیں میرے
سُخن کا گھر زرِ تاوان سے بناتا ہُوں

جہاں کُچھ اور بنانے کا کام رَہ جائے
وہ گوشہ مَیں کسی امکان سے بناتا ہُوں

کبھی کبھی کسی ویراں میں جا نکلتا ہے
وہ راستہ جسے گُنجان سے بناتا ہُوں

یہ کعبہ، دیر و حَرم اور مسجد و محراب
مَیں یہ عمارتیں ایمان سے بناتا ہُوں

لپکتی آگ کے تہوار کا خُدا حافظ
مرے چراغ کی گُفتار کا خُدا حافظ

یہ بھی کہیں مرے سَر کے نہ ساتھ جُھک جائے
بدن کی شاخِ ثمر بار کا خُدا حافظ

جناب پُورے اُترتے نہیں خُود اس پر آپ
جناب! آپ کے معیار کا خُدا حافظ

ہٹا کے شہر سے ملبے کو آیئے دیکھیں
ہُوا ہے کون سے دو چار کا خُدا حافظ

کہاں لگانا ہے دروازہ جانتا ہُوں مَیں
مجھے گُزرنا ہے دیوار کا خُدا حافظ

کوئی بھی چیز نہیں ہے یہاں ٹھکانے پر
بَنا ہے کیوں مرے گھر بار کا خُدا حافظ

عجیب شخص ہو کہتے ہو کس لیے مُجھ سے
بچھڑتے وقت، یہ بیکار کا خُدا حافظ

زیادہ تر تو جُگالی ہی کر رہے ہیں یہاں
غزل میں آج کے اظہار کا خُدا حافظ

اچھا ہے اسی صُورتِ احوال میں مِل جاؤ
پھر جانے کہاں گردِ مہ و سال میں مِل جاؤ

تَلْپَٹ ہے محبت کی زمیں چَین نہیں ہے
آ کر مجھے اس روز کے بھونچال میں مِل جاؤ

اس واسطے باندھا ہے الگ راگ میں تُم کو
تُم بھی نہ کسی اور کے سُر تال میں مِل جاؤ

رہنا ہے ہمیشہ، تو مرے شعر میں آ کر
لفظوں سے بنائی ہُوئی اَشکال میں مِل جاؤ

ویسے یہ زمیں مِلنے کی خاطر نہیں اچھی
مِلنے کو تو تُم بھی اسی جنجال میں مِل جاؤ

لوگوں کو یہاں روشنی اچھی نہیں لگتی
دروازے مُقفّل کرو ہڑتال میں مِل جاؤ

سُنتے ہیں کہ ہونا ہے حسابِ زر و گوہر
ہوسکتا ہے تُم بھی رضاؔ ہڑتال میں مِل جاؤ

جنگ سے لے کر عدو کی ہار تک
ہاتھ سے چھوڑی نہیں تلوار تک

بھیڑیے کُچھ آ گئے تھے شہر میں
چھوڑ کر آیا ہُوں اُن کو غار تک

یہ زبانیں ہیں کہ چُھریاں کیا خبر
دیکھ کر حیراں ہُوا لوہار تک

گُدڑیاں اُتریں تو ننگے ہو گئے
صوفیوں میں آ گُھسے مکار تک

پوتڑے اُن کے اُنھی کے سامنے
حق تو پہنچے گا ہر اک حق دار تک

کیا کہوں خُود، دیکھ لیجے کون لوگ
کھا رہے ہیں بھائی کا مُردار تک

دُشمنوں کے ساتھ مِل کر بھاگ اُٹھے
اتنے بُزدل ہو گئے کُچھ یار تک

مَیں جب اپنے سامنے سے ہٹ گیا
راستہ دینے لگی دیوار تک

دیکھنا اب میرے شُعلے کی لپک
بات پہنچی ہے مرے اظہار تک

مَیں حسینی ہُوں رضاؔ پہچاؤں گا
ہر یزیدی کیفرِ کردار تک

لڑنے میں بے مثال بہت دیر تک رہا
مَیں پیشِ ہائے ڈھال بہت دیر تک رہا

پاؤں نہ اپنے جُھوٹ کے دیکھے تو ایک روز
لوگوں میں اشتعال بہت دیر تک رہا

سُورج گرہن چند ہی لمحوں کا تھا مگر
کِرنوں کا وُہ قتال بہت دیر تک رہا

سوچا ہے آج غم کو اُٹھا کر سنبھال لُوں
یہ نقش پائمال بہت دیر تک رہا

مُجھ سے لپٹ کے سبز کوئی بیل تو ہُوئی
مَیں زرد اور نڈھال بہت دیر تک رہا

مُجھ سے بندھا ہُوا کوئی پتھر وجود کا
ڈوبا تو پھر اُچھال بہت دیر تک رہا

لیکن کہاں ہے آج کسی کو خبر نہیں
جو کُچھ بھی لازوال بہت دیر تک رہا

بہروپیے بھی آ گھُسے احباب میں مرے
سوچا تو یہ ملال بہت دیر تک رہا

کیا کسی کارِ ضرورت میں یہاں آئے ہو
یہ جو تُم میری محبت میں یہاں آئے ہو

عشق بننے میں ہیں درکار زمانے اس کو
تُم ابھی جسم کی عادت میں یہاں آئے ہو

ورنہ ملنے کا کوئی اور سلیقہ ڈھونڈو
پاس بیٹھو جو فراغت میں یہاں آئے ہو

رنگ تو زرد ہے آنکھوں میں چمک ہے لیکن
ہجر کے بعد کی حالت میں یہاں آئے ہو

میرے اندر کی بیابانی سے گھبرا گئے تُم
کیا کسی اور کی وحشت میں یہاں آئے ہو

ایسے اُٹھّے ہو کہ بیٹھے بھی نہیں تھے جیسے
کیا کسی سانس کی مُہلت میں یہاں آئے ہو

تُمھیں لگتا ہے یہ آنا جو نہ آنے کی طرح
تُم اسی بار حقیقت میں یہاں آئے ہو